40

ہفت روزہ

ندائے خلافت

لاہور

یکم تا 7 نومبر 2007ء/18 تا 24 شوال 1428ھ

www.tanzeem.org

اس شمارے میں

آگ کا کھیل

انسان کا اہم ترین مسئلہ

مولانا مودودی مرحوم اور تحریکِ اقامتِ دین

علامہ اقبال اور سید سلیمان ندوی

قابل نفرت فوج نہیں، حکمران ہیں

جنگی مجرم

دعوتی و تربیتی سرگرمیاں

عالم اسلام

اللہ سے مغفرت طلب کرو

﴿وَاسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْا اِلَيْهِ ؕ اِنَّ رَبِّيْ رَحِيْمٌ وَّدُوْدٌ﴾ (ھود:90)

''اور مغفرت طلب کرو اپنے رب سے، پھر (دل و جان سے) رجوع کرو اس کی طرف۔ بے شک میرا رب بڑا مہربان (اور) پیار کرنے والا ہے۔''

اپنے بارِ گناہ کو دیکھ کر اس کی رحمت سے مایوس نہ ہو۔ یہ خیال نہ کرو کہ عمر بھر تو اس کی سرکشی کرتے رہے، اب آخر میں کیا خاک مسلمان ہوں گے؟ یہاں مایوسی کی کوئی گنجائش نہیں۔ اگر تم اپنے گناہوں پر اظہارِ ندامت کرتے ہوئے مغفرت طلب کرو گے اور آئندہ کے لیے اِس کے ساتھ اطاعت و انقیاد کا پیمانِ وفا باندھو گے تو تمہیں اللہ تعالیٰ اپنے دامنِ رحمت میں جگہ عطا فرمائے گا۔ اس کی مغفرت کا ایک چھینٹا تمہاری عمر بھر کی غلطیوں اور نادانیوں کے لیے کافی ہوگا۔ کیونکہ میرا رب جس کی رحمت واسعہ کی میں تم کو خوشخبری دے رہا ہوں، جس کی بارگاہ عزت میں حاضر ہونے کی میں تمہیں ترغیب دے رہا ہوں، جس کے دامنِ کرم میں سر چھپانے کی میں تمہیں دعوت دے رہا ہوں، اس کی رحمت بے پایاں ہے۔ اس کا بحرِ کرم بیکراں ہے۔ اس کی عنایات کا بادل جب برستا ہے تو ہر چیز کو سیراب کر دیتا ہے اور نہ صرف یہ کہ اس کی رحمت بے پایاں ہے بلکہ زمین و آسمان کا واحد مالک ہونے کے باوجود وہ اپنے بندوں سے نفرت نہیں کرتا اور انہیں نظرِ حقارت سے نہیں دیکھتا بلکہ محبت فرماتا ہے اور جب کوئی روسیاہ شکستہ دل ہو کر اس کے حضور میں حاضر ہوتا ہے تو اسے بے پایاں مسرت ہوتی ہے۔ میں تمہیں ایسے رحیم اور ودود کے دربار میں باریابی بخشنے کے لیے اتنا بے چین و بے قرار ہوں۔

تفسیر ضیاء القرآن (جلد دوم)

پیر محمد کرم شاہ الازہری

الھدیٰ (296)

ڈاکٹر اسرار احمد

سورۃ الانعام
(آیات: 52 تا 53)

بسم اللہ الرحمٰن الرّحیم

﴿وَلَا تَطْرُدِ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ ؕ مَا عَلَيْكَ مِنْ حِسَابِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ وَّمَا مِنْ حِسَابِكَ عَلَيْهِمْ مِّنْ شَيْءٍ فَتَطْرُدَهُمْ فَتَكُوْنَ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۵۲﴾ وَكَذٰلِكَ فَتَنَّا بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لِّيَقُوْلُوْٓا اَهٰٓؤُلَآءِ مَنَّ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنْۢ بَيْنِنَا ؕ اَلَيْسَ اللّٰهُ بِاَعْلَمَ بِالشّٰكِرِيْنَ ﴿۵۳﴾﴾

''اور جو لوگ صبح و شام اپنے پروردگار سے دعا کرتے ہیں (اور) اُس کی ذات کے طالب ہیں اُن کو (اپنے پاس سے) مت نکالو۔ اُن کے حساب (اعمال) کی جوابدہی تم پر کچھ نہیں اور تمہارے حساب کی جوابدہی اُن پر کچھ نہیں (پس ایسا نہ کرنا)۔ اگر اُن کو نکالو گے تو ظالموں میں ہو جاؤ گے، اور اسی طرح ہم نے بعض لوگوں کی بعض سے آزمائش کی ہے کہ (جو دولت مند ہیں وہ غریبوں کی نسبت) کہتے ہیں، کیا یہی لوگ ہیں جن پر اللہ نے ہم میں سے فضل کیا ہے۔ (اللہ نے فرمایا) بھلا اللہ شکر کرنے والوں سے واقف نہیں؟''

تمام رسولوں کے ساتھ یہ معاملہ ہوا، خاص طور پر نوحؑ کے ساتھ کہ اُن کی قوم کے سردار کہتے تھے، اے نوح، ہم تو تمہارے پاس آنا چاہتے ہیں اور بات سمجھنا چاہتے ہیں مگر تمہارے پاس تو ہر وقت ہمارے کمیں کاری اور ادنیٰ لوگ بیٹھے ہوتے ہیں، اور یہ ہماری شان اور مرتبے کے خلاف ہے کہ ہم ان کے ساتھ بیٹھیں۔ یہی بات قریش مکہ نبی اکرم ﷺ سے کہتے تھے کہ ہم تو آپؐ کی بات سمجھنے کے لئے آپؐ کے پاس آتے ہیں مگر وہاں ہمارے غلام قسم کے لوگ اور معاشرے کے پست طبقات کے افراد بیٹھے ہوتے ہیں اور یہ بات ہماری شان کے منافی ہے کہ ہم ان کی موجودگی میں آپؐ سے بات کریں۔ اس پر جواب دیا جا رہا ہے کہ اے نبیؐ! آپؐ اُن کی باتوں سے کوئی اثر نہ لیں۔ آپ خواہ مخواہ اپنے ان ساتھیوں کو اپنے سے دور نہ کریں، چاہے وہ غریب، مسکین اور معاشرے کے پست طبقات سے ہوں جبکہ اُن کی شان تو یہ ہے کہ وہ صبح شام اللہ کو پکارتے، اسی کی تسبیح و مناجات کرتے اور اُسی سے دعائیں مانگتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں کہ جو اللہ کی رضا کے طالب ہیں اور جنہوں نے اپنی جانیں اللہ کی رضا جوئی کے لئے وقف کر دی ہیں۔ آپؐ کے ذمہ ان کے حساب میں سے کچھ نہیں ہے اور نہ ہی آپؐ کے حساب میں سے ان کے اوپر کچھ ہے۔ جو آپؐ کے پاس آ رہے ہیں، ان کا حساب بھی وہ لے گا اور جو آپؐ کے پاس نہیں آ رہے ان کا حساب بھی وہ لے لے گا۔ وہ ہر ایک کو اس کے طرزِ عمل کے مطابق بدلہ دے گا۔ یعنی نہ تو آپؐ اُن کی طرف سے جواب دہ ہیں اور نہ یہ آپؐ کی طرف سے جواب دہ ہیں تو اگر خدانخواستہ بالفرض آپؐ ان سرداروں کے دباؤ میں آ کر ان مخلصین کو دھتکار دیں گے تو پھر آپ ظالموں میں سے ہو جائیں گے۔

اور اسی طرح ہم بعض کو بعض کے ذریعہ آزمائیں گے۔ ہوتا یوں ہے کہ ایک مفلس اور کم حیثیت آدمی سچی بات کہتا ہے تو اُس کی بات سن کر دولت مند آدمی اس کا مذاق اُڑاتا ہے کہ یہ پھٹے پرانے کپڑے پہنے بے حیثیت آدمی مجھے سمجھانے آیا ہے، یہ اپنی حیثیت کو بھی نہیں پہچانتا۔ یہ انداز فکر تکبر کی علامت ہے۔ دیکھنا تو یہ چاہیے کہ آیا بات صحیح ہے یا غلط خواہ کہنے والا کوئی بھی ہو۔ وہ سردار کہتے تھے کہ کیا ہمارے درمیان یہی لوگ ہیں جن پر اللہ نے احسان کیا ہے؟ اللہ تعالیٰ کا احسان اُن پر نہیں بلکہ ہم پر ہے۔ چنانچہ ہم دولت مند اور خوشحال ہیں، سردار ہیں، ہماری حویلیاں اور جائیدادیں ہیں، یہ گرے پڑے لوگ تو کسی شمار میں نہیں۔ اگر اللہ کو قرآن بھیجنا ہی تھا اور نبوت دینی ہی تھی تو مکہ اور طائف میں بڑے بڑے سردار اور سرمایہ دار لوگ موجود ہیں، ان میں سے کسی کو نبوت ملتی اور اُس پر کتاب اتاری جاتی۔ یہ مکے کا یتیم، جس کے پاس کوئی دولت نہیں، جس کا بچپن مفلسی سے گزرا اور جوانی مشقت میں، جس کے پاس قریش کا کوئی منصب اور عہدہ نہیں تھا، جو پیدا ہی یتیم ہوا، تو کیا یہی رہ گیا تھا کہ نبوت اور وحی اسے ملے۔ اللہ کو اس کے علاوہ اس کام کے لئے کوئی دوسرا نہیں ملا، (معاذ اللہ) اللہ نے واضح کر دیا کہ یہ سوچ غلط ہے۔ کیا اللہ تعالیٰ زیادہ واقف نہیں ان سے جو واقعتاً اس کا شکر ادا کرنے والے ہیں۔ ایک اور جگہ آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے کہ اُسے رسالت کا منصب کس کو دینا ہے۔ واللہ اعلم حیث یجعل رسالتہ۔ طالوت کے بارے میں بھی لوگوں نے یہی کہا تھا کہ یہ سرداری کے لائق کیسے ہوا، جبکہ اس کے پاس دولت نہیں۔ تو کہا گیا تھا کہ اسے جسم اور علم میں کشادگی عطا کی گئی ہے۔ یعنی دولت، شہرت، عہدہ اور منصب نبوت کی اہلیت کی بنیاد نہیں ہیں۔ یہ تو اللہ تعالیٰ کی عطا ہے، جسے چاہتا ہے دیتا ہے۔

فرمانِ نبویؐ

پروفیسر محمد یونس جنجوعہ

امت میں پیدا ہونے والے فتنے

عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ ؓ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ:

((يَتَقَارَبُ الزَّمَانُ وَيُقْبَضُ الْعِلْمُ وَتَظْهَرُ الْفِتَنُ وَيُلْقَى الشُّحُّ وَيَكْثُرُ الْهَرْجُ)) قَالُوْا وَمَا الْهَرْجُ؟ قَالَ ((الْقَتْلُ)) (متفق علیہ)

حضرت ابو ہریرہ ؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ: ''(وقت آئے گا کہ) زمانہ قریب قریب ہو جائے گا، اور علم اٹھا لیا جائے گا، اور فتنے نمودار ہوں گے، اور (انسانی طبیعتوں اور دلوں میں) بخل ڈال دیا جائے گا، اور بہت ہوگا ہرج''۔ صحابہؓ نے عرض کیا: ''ہرج'' کا کیا مطلب؟ آپؐ نے ارشاد فرمایا: ''(اس کا مطلب ہے) کشت و خون۔''

تا خلافت کی بنا' دنیا میں ہو پھر استوار
لا کہیں سے ڈھونڈ کر اسلاف کا قلب وجگر

قیام خلافت کا نقیب

ہفت روزہ — لاہور

ندائے خلافت

جلد 16 — یکم تا 7 نومبر 2007ء — 18 تا 24 شوال المکرم 1428ھ — شمارہ 40

بانی: اقتدار احمد مرحوم
مدیر مسئول: حافظ عاکف سعید
نائب مدیر: محبوب الحق عاجز

مجلس ادارت
سید قاسم محمود۔ ایوب بیگ مرزا
سردار اعوان۔ محمد یونس جنجوعہ
نگران طباعت: شیخ رحیم الدین

پبلشر: محمد سعید اسعد' طابع: رشید احمد چوہدری
مطبع: مکتبہ جدید پریس' ریلوے روڈ' لاہور

مرکزی دفتر تنظیم اسلامی:
67۔اے' علامہ اقبال روڈ' گڑھی شاہو' لاہور۔54000
فون: 6366638 - 6316638 فیکس: 6271241
E-Mail:markaz@tanzeem.org
مقام اشاعت: 36۔کے' ماڈل ٹاؤن' لاہور۔54700
فون: 03-5869501

قیمت فی شمارہ 5 روپے

سالانہ زرِ تعاون
اندرونِ ملک.....250 روپے
بیرون پاکستان
انڈیا----------(2000 روپے)
یورپ' ایشیا' افریقہ وغیرہ (2500 روپے)
امریکہ' کینیڈا' آسٹریلیا وغیرہ (3000 روپے)
ڈرافٹ' منی آرڈر یا پے آرڈر
''مکتبہ خدام القرآن'' کے عنوان سے ارسال کریں
چیک قبول نہیں کیے جاتے

''ادارہ'' کا مضمون نگار حضرات کی رائے سے پورے طور پر متفق ہونا ضروری نہیں

اداریہ

ایوب بیگ مرزا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

آگ کا کھیل

1917ء کے بالشویک انقلاب کے بعد سوویت یونین ایک عظیم قوت کی حیثیت سے ابھرا۔ مشرقی یورپ اُس کے زیر تسلط تھا۔ مغربی یورپ اُس کی عسکری قوت اور بعد ازاں اُس کی ایٹمی صلاحیت سے لرزتا تھا۔ ہندوستان جو برطانیہ کی کالونی تھی اور سوویت یونین کے ہمسایہ کی حیثیت رکھتا تھا، وہاں شدید خطرہ محسوس کیا جانے لگا کہ سوویت یونین اُس کے خلاف کسی وقت قوت کا مظاہرہ کر سکتا ہے۔ جنگ عظیم دوئم جیتنے کے باوجود برطانیہ کمزور ہو چکا تھا۔ چین میں سرخ انقلاب برپا ہوا تو اُس نے سوویت یونین کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا۔ یوں محسوس ہونے لگا کہ سرخ سامراج سفید سامراج کا دھڑن تختہ کر دے گا۔ بین البراعظمی اور بین الاقوامی ایٹمی میزائل کی دوڑ میں وہ بہت تیزی سے آگے نکل رہا تھا۔ خلا میں راکٹ اُس نے امریکہ سے پہلے بھیجا لیکن عسکری قوت کی پشت پر عوامی قوت نہیں تھی اور معاشی جبر نے معیشت کا جنازہ نکال دیا تھا۔ 1979ء میں اپنی اِن کمزوریوں کو عسکری قوت سے ڈھانپنے کے لئے اور معیشت کی بہتری کے لئے گرم پانیوں تک رسائی حاصل کرنے کی غرض سے اُس نے افغانستان پر حملہ کر دیا۔ چند دنوں میں کابل پر قبضہ کر لیا، یوں محسوس ہوتا تھا کہ ایک آدھ ماہ میں پورے افغانستان پر کنٹرول حاصل کر لے گا۔ یہ بھی کہا جانے لگا کہ وہ بہت جلد پاکستان کو روندتا ہوا گرم پانیوں تک پہنچنے کے خواب کو حقیقت میں بدل دے گا۔ انہی دنوں برطانیہ کی سابق وزیراعظم مارگریٹ تھریچر جنہیں سوویت یونین طنزاً ''خاتونِ آہن'' کہتا تھا، وزارتِ عظمیٰ سے فارغ ہو کر پاکستان کے دورہ پر تشریف لائیں۔ وہ صوبہ سرحد بھی گئیں۔ اُنہوں نے پاک افغان سرحد پر جانے کی خواہش ظاہر کی۔ سوویت یونین اُس وقت پورے جوبن پر تھا۔ اِس موقع پر مارگریٹ تھریچر نے پاک افغان سرحد پر افغانستان کی طرف منہ کر کے باآواز بلند کہا تھا: "We learnt our lesson in Afghanistan. Oh! Russians! you will learn your lesson here in coming days."

(ہم نے افغانستان میں اپنا سبق سیکھا۔ اے روسیو! تم آنے والے دنوں میں اپنا سبق سیکھو گے۔)

پھر وہی ہوا۔ اپنی پوری عسکری قوت کو افغانستان میں جھونک دینے کے باوجود وہ چھ سال تک افغانستان پر اپنا قبضہ مکمل نہ کر سکا اور زخمی ہاتھی کی طرح چنگاڑنے لگا اور بالآخر خود پاش پاش ہو گیا۔ مارگریٹ تھریچر نے سچ کہا تھا۔ جب برطانوی سلطنت میں سورج غروب نہیں ہوتا تھا، تب بھی وہ براہِ راست افغانستان پر قبضہ نہ کر سکا اور ایک سے زائد مرتبہ پسماندہ افغانیوں نے فرسودہ ہتھیاروں کے ساتھ انگریز افواج کو زچ کیا۔ دانا انگریز جلد جان گیا کہ باغیرت اور جنگ و جدل کو اپنی زندگی کا حصہ سمجھنے والے افغانیوں کو براہ راست غلام نہیں بنایا جا سکتا، لہٰذا انگریز اُن کے باہمی جھگڑوں سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اور بعض قابلِ فروخت افراد کی مدد سے افغانستان کے حالات پر اثر انداز تو ہوتا رہا، کبھی اُنہیں براہ راست غلام نہ بنایا۔ جو بات انگریز نے اپنی دانائی سے سمجھی وہ بات روسیوں کو میدان جنگ میں ہزیمت اٹھا کر اور شکست و ریخت سے دوچار ہو کر سمجھ آئی۔

پاکستان سے منسلک آزاد قبائل کی معاشرت، اُن کا طرزِ بود و باش، اُن کے طور طریقے افغانیوں سے رتی بھر مختلف نہیں۔ وہ بھی مذہبی غیرت، دینی حمیت رکھتے ہیں، انہیں بھی اسلحہ اولاد سے زیادہ عزیز ہے، جنگ و جدل اُن کی زندگی کا بھی جزو لاینفک ہے۔ بانیٔ پاکستان قائداعظم محمد علی جناح نے یونہی سوچے سمجھے بغیر نہیں کہہ دیا تھا کہ ہم قبائلی علاقوں میں کبھی فوج متعین نہیں کریں گے، یہ تاریخ کے مطالعہ کا نتیجہ تھا۔ یہ اُن کی سیاسی بصیرت کا ثبوت تھا۔ آج کے ہمارے حکمران سادہ عقل اور عام سیاسی بصیرت سے بھی محروم ہیں۔ مذہبی غیرت اور دینی حمیت کے ساتھ ساتھ انسانی ہمدردی کے عام جذبہ سے بھی عاری ہیں۔ تاریخ کو وہ ایک فرسودہ اور بوسیدہ شے سمجھتے ہیں۔ سالوں کی لیفٹ رائٹ اور بوٹوں کے کھڑاک کے ساتھ سلیوٹ پر سلیوٹ اُنہیں مطلق العنان بنا دیتا ہے، جمہوری کلچر اُن کے قلب اور ذہن

میں جگہ نہیں بنا سکتا۔ مذاکرات کو وہ وقت کا ضیاع سمجھتے ہیں۔ وہ سنو اور مانو کے قائل ہوتے ہیں جو فوجی نظام کے لحاظ سے انتہائی اہم ہی نہیں ناگزیر بھی ہے، لیکن حکمرانی کے حوالہ سے یہ تباہ کن عمل ہے۔

ہمارے فوجی حکمرانوں نے امریکی آقاؤں کی خوشنودی کے لئے اِس علاقہ میں آگ بھڑکا دی ہے۔ نادان یہ نہیں سمجھ سکے آگ بھڑکانے والا بھی آگ کا رخ متعین نہیں کر سکتا، اُسے تو ہوا کے رخ پر پھیلنا اور بڑھنا ہے۔ آزاد قبائلیوں اور صوبہ سرحد کے پٹھانوں میں بھی بہت دینی ہم آہنگی ہے۔ مذہبی غیرت اور دینی حمیت کا جذبہ یہاں بھی بہت قوی ہے۔ معاشرتی زندگی میں بھی بہت مماثلت موجود ہے۔ لہٰذا آگ کا اِس طرف بڑھنا ہے اِسی طرح یقینی تھا جس طرح سورج کا مشرق سے طلوع ہونا۔ بہرحال آگ اور خون کا یہ کھیل اب سوات میں کھیلا جا رہا ہے۔ حکومت کی توپیں اور گن شپ ہیلی کاپٹر آگ برسا رہے ہیں۔ اہلِ علاقہ جنہیں مذہب سے شدید لگاؤ ہے فضل اللہ کی قیادت میں ڈٹے ہوئے ہیں اور مسلمان مسلمان کا خون بے دردی سے بہا رہا ہے۔ اُنہیں اُن کے گھروں اور شہروں سے نکلنے پر مجبور کیا جا رہا ہے۔ فوجی حکمران اپنے عوام کو listen and obey کی تلقین کر رہا ہے اور بزور بازو اطاعت کروانا چاہتا ہے لیکن اُن کا مطالبہ یہ ہے کہ شریعت نافذ کی جائے۔ حکومت کے رضامند نہ ہونے پر اُنہوں نے خود شرعی عدالتوں کا انعقاد کرنا شروع کر دیا ہے۔ اُن کا کہنا یہ ہے کہ ہم صرف اللہ اور اُس کے رسول کی سنیں اور مانیں گے۔ آگ جغرافیائی لحاظ سے بھی پھیل رہی اور ذہنوں میں بھی بھڑک رہی اور سینوں کو بھی جلا رہی ہے۔ اندرونی سطح پر فاصلے بڑھ رہے ہیں اور بیرونی دشمن تاک میں بیٹھا ہے۔

کوئی ہے جو حکمرانوں سے پوچھے کہ مشرقی پاکستان میں طاقت کے استعمال کا نتیجہ کیا نکلا تھا۔ بلوچستان میں طاقت کے استعمال سے کیا نتائج برآمد ہو رہے ہیں۔ دھماکے اور خودکش حملے روز کا معمول کیوں بن گئے ہیں۔ شمالی اور جنوبی وزیرستان سے جو لوگ بنوں اور صوبہ کے اندرونی حصوں میں منتقل ہو رہے ہیں، سوات سے جو لوگ ہجرت کر رہے ہیں، کیا وہ اِس آگ کو صوبے کے دوسرے آخری حصے تک منتقل نہ کریں گے۔ بھارت کو اپنا ازلی دشمن قرار دینے کے باوجود تم مذاکرات کے لئے اُن کے ترلے منتیں کر رہے ہو، تم اپنے مسلمان بھائیوں اور ہم وطنوں سے مذاکرات کیوں نہیں کرتے۔ امریکہ کا رٹا رٹایا سبق دہشت گردوں سے کوئی مذاکرات نہیں ہو سکتے، اُس کا ہی ورد کیوں کرتے ہو۔ حکمران تو اِس جنگ کے کھلاڑی اور اپنے بیرونی آقاؤں کے اشاروں پر ناچ رہے ہیں، معاشرے کے باقی طبقات کو کیوں سانپ سونگھ گیا ہے۔ سیاست دان محض لیلائے اقتدار کے دیوانے ہیں۔ وہ دن رات انتخابی سرگرمیوں میں مصروف ہیں۔ مذہبی سیاسی جماعتیں جنہیں اِس آگ کو سرد کرنے کے لئے فائر بریگیڈ کا رول ادا کرنا چاہیے تھا وہ بھی انتخابات کے چکر میں ہیں، پھر یہ کہ وہ باہمی طور پر دست و گریباں ہیں۔ لہٰذا وہ بھی محض بیان بازی تک محدود ہیں۔ سول سوسائٹی بھی خاموش تماشائی بنی ہوئی ہے اور صرف ڈرائنگ رومز میں بطور شغل تشویش کا اظہار ہو رہا ہے۔ ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ گھر والے اگر لڑ رہے ہوں تو بدطینت ہمسائے پہلے صرف تماشا دیکھتے ہیں پھر جلتی پر تیل ڈالتے ہیں (یہ دونوں کام ہمارے ہمسائے سرانجام دے رہے ہیں) پھر یہ کہہ کر جنگ میں کود پڑتے ہیں کہ تمہاری جنگ سے ہماری سلامتی کو خطرہ لاحق ہو گیا تھا۔ پھر اِس گھر کی بندر بانٹ کر لیتے ہیں۔ اگر ہم نے اِس آگ کو سرد نہ کیا اور آگ کے اِس کھیل کو بند نہ کیا تو نتیجہ یہی نکلے گا۔ یاد رہے، مشرق میں پاکستان کا دشمن بھارت ہے اور شمال مغرب میں اسلام کے دشمن امریکہ کی فوجیں موجود ہیں۔

بقیہ: کالم آف دی ویک

مشکلات بڑھ رہی ہیں۔ وہ جارج ڈبلیو بش اور کنڈولیزا رائس جنہیں ان کے اپنے ملک میں ''جنگی مجرم'' قرار دیا جا رہا ہے انہیں راضی کرنے کے لئے ہم اپنے ملک میں جنگی جرائم کے مرتکب ہو رہے ہیں اور منہ بھر بھر لبرل فاشٹ جنگی جرائم کی شرح میں اضافے کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ جنگی جرائم مذہب کے نام پر کئے جائیں یا روشن خیالی کے نام پر، دونوں پاکستان کے لئے نقصان دہ ہیں۔ آج پاکستان میں جنگی مجرموں کو بے نقاب کرنے اور ان کے خلاف تحریک کی ضرورت ہے۔ امریکہ کے جنگی مجرم اور پاکستان کے جنگی مجرم ایک دوسرے کے ساتھی ہیں، لہٰذا امریکہ کے امن پسندوں اور پاکستان کے امن پسندوں کو بھی ایک دوسرے کا ساتھ دینے کی ضرورت ہے۔ جنگی شدت پسند اور جنگی مجرم اقلیت میں ہیں اور امن پسند اکثریت میں ہیں۔ اگر یہ امن پسند متحد ہو جائیں تو ہم ان جنگی مجرموں کو ان کے انجام تک پہنچانے میں کامیاب ہو سکتے ہیں۔ (بشکریہ روزنامہ ''جنگ'')

ضرورت رشتہ

☆ راجپوت فیملی کو اپنی بیٹی، عمر 22 سال، تعلیم بی اے، صوم وصلوٰۃ کی پابند کے لئے دینی گھرانے سے مناسب رشتہ درکار ہے۔ رفیق تنظیم کو ترجیح دی جائے گی۔
برائے رابطہ: 0323-4026058 0300-4708607

☆ لڑکی، عمر 26 سال، تعلیم ایم اے ہسٹری کے لئے لاہور کے رہائشی، تعلیم یافتہ اور برسرروزگار نوجوان کا رشتہ درکار ہے۔ برائے رابطہ: 0302-4304729

☆ سرگودھا میں مقیم، صدیقی خاندان سے تعلق، عمر 38 سال، MA B.Ed محکمہ تعلیم میں گریڈ 18 میں ملازم خاتون کے لئے مناسب رشتہ مطلوب ہے۔
برائے رابطہ: 0321-4263353

☆ بلوچ خاندان کو اپنے بیٹوں عمر بالترتیب 26 اور 24 سال، تعلیم B.com ایف اے، ذاتی کاروبار، کے لئے رشتے درکار ہیں۔ ذات پات کی قید نہیں، طلاق یافتہ، خلع یافتہ اور بیوہ بھی رجوع کر سکتی ہیں۔ برائے رابطہ: محمد علی کورائی
0300-2368462 021-4993464-65

☆ بچی، عمر 22 سال، تعلیم ایم اے اسلامیات، ایم فل، پابند صوم وصلوٰۃ، اہل حدیث کے لیے دینی مزاج کے حامل گھرانے سے برسرروزگار لڑکے کا رشتہ درکار ہے۔ برائے رابطہ: حاجی محمود ظفر، 0304-4086707

☆ چار لڑکیاں تعلیم ایم اے، اہل سنت والجماعت گھرانے سے تعلق (خاندان کمبوہ اور راجپوت) عمریں 30 سے 35 سال کے درمیان ہیں، ذات پات کی کوئی قید نہیں، کے لئے مناسب رشتے درکار ہیں۔ برائے رابطہ: 042-5168811

دعائے مغفرت

☆ تنظیم اسلامی حلقہ لاہور کے رفیق جناب تنویر جاوید چغتائی وفات پا گئے۔

☆ تنظیم اسلامی نیو ملتان کے ملتزم رفیق محمد ظفر اقبال کی والدہ وفات پا گئیں۔

اللہ تعالیٰ مرحومین کی مغفرت فرمائے۔ آمین، قارئین سے دُعائے مغفرت کی اپیل ہے

تصحیح

گزشتہ شمارے میں ''منبر و محراب'' کے تحت محترم بانی تنظیم اسلامی کے خطاب عید کی جو تلخیص دی گئی تھی، اس میں صفحہ 7 کے پہلے کالم میں قرآنی آیات کا حوالہ سہواً المائدہ: 157 درج ہو گیا تھا۔ صحیح حوالہ النساء: 157 ہے۔ (ادارہ)

قرآن حکیم کی رو سے
انسان کا اہم ترین مسئلہ

مسجد دارالسلام باغ جناح لاہور میں امیر تنظیم اسلامی محترم حافظ عاکف سعید صاحب کے 19 اکتوبر 2007ء کے خطبۂ جمعہ کی تلخیص

[آیات قرآنی کی تلاوت اور خطبہ مسنونہ کے بعد!]

حضرات! چند دن پہلے رمضان کا بابرکت اور مقدس مہینہ اختتام پذیر ہوا۔ اِس مہینے ہم مسلمانوں کو کیا کرنا ہے، اِس بارے میں بالعموم ہم مسلمانوں کا ذہن واضح ہوتا ہے۔ ہم میں سے ہر شخص یہ سمجھتا ہے کہ وہ دن کو روزہ رکھے، رات کو تراویح پڑھے۔ یہ بات بھی بہت سے لوگوں کے ذہنوں میں ہوتی ہے کہ رات کا زیادہ سے زیادہ حصہ قرآن حکیم کے ساتھ بسر کیا جائے۔ پھر یہ کہ روزے کی حالت میں جن چیزوں سے رُکنا ہے، مثلاً جھوٹ، غلط بات اور حرام امور وغیرہ، لوگوں کی قابل ذکر تعداد اِن سے بھی نہ صرف آگاہ ہوتی ہے، بلکہ اِن سے احتراز بھی کرتی ہے۔ مگر افسوسناک بات یہ ہے کہ جیسے ہی ماہ رمضان تکمیل کو پہنچتا ہے، لوگوں میں فرائض کی ادائیگی اور نیکی و اطاعت کا جذبہ ماند پڑنے لگتا ہے۔ سرکشی و نافرمانی سے اجتناب اور ترک معاصی کا سلسلہ ختم ہو جاتا ہے، اور دین اور اُس کے احکامات سے وہ بغاوت پھر سے شروع ہو جاتی ہے، جو رمضان سے پہلی چلی آتی تھی۔ یوں ہم اپنے عمل سے یہ ظاہر کرتے ہیں کہ رمضان میں دینی پابندیاں اختیار کرنے کے بعد غیر رمضان میں ہمیں شریعت سے انحراف اور آسمانی ہدایت سے روگردانی کا لائسنس مل گیا ہے۔ اب ہم جو چاہیں کریں، ہم پر کوئی پابندی نہیں۔ اب ہم خواہ نفس کی غلامی کریں، خواہ زمانے کے غلط رجحانات کی پیروی کریں، ہم پر اِس کا کوئی وبال نہیں آئے گا۔ اِس کی سب سے بڑی مثال نمازوں میں مسلمانوں کی حاضری میں کمی ہے۔ وہی مساجد جو رمضان میں بھری ہوتی ہیں، بعد ازاں اُن میں حاضری چند صفوں تک محدود ہو کر رہ جاتی ہے۔

یہ طرزِ عمل سراسر دین کے منافی ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ روزہ کا مدعا تقویٰ ہے اور رمضان کا مہینہ تقویٰ کی تربیت کا مہینہ ہے۔ روزے سے مقصود یہ ہے کہ بندۂ مومن اپنے اندر تقویٰ کی اتنی پونجی جمع کر لے کہ جس کے سبب وہ غیر رمضان میں اپنے آپ کو طاعات پر کاربند رکھ سکے اور گناہوں اور معاصی سے مجتنب رہ سکے۔ روزہ کی حالت میں اگر ایک مسلمان محض اللہ کی رضا کی خاطر اُس کی حلال کردہ چیزوں سے اپنے آپ کو بچاتا ہے تو اُس کے اندر تقویٰ کی وہ روحانی قوت ضرور پیدا ہو جانی چاہیے جو بقیہ گیارہ مہینے اُسے حرام چیزوں سے بچا سکے۔

ایک بہت پیاری مسنون دُعا ہے۔

اَللّٰھُمَّ اقْسِمْ لَنَا مِنْ خَشْیَتِکَ مَاتَحُوْلُ بِہٖ بَیْنَنَا وَبَیْنَ مَعْصِیَتِکَ

''اے اللہ! ہمیں اپنی ذات کا اتنا خوف اور تقویٰ عطا فرما جسے آپ ہمارے اور اپنی نافرمانی کے درمیان دیوار بنا دیں۔''

وَمِنْ طَاعَتِکَ مَا تُبَلِّغُنَا بِہٖ جَنَّتَکَ

''اور ہمیں اتنی اطاعت کرنے کی توفیق دے دیں جس کے طفیل آپ ہمیں جنت میں پہنچا دیں۔''

وَمِنَ الْیَقِیْنِ مَاتُھَوِّنُ بِہٖ عَلَیْنَا مَصَائِبَ الدُّنْیَا

''اور اتنا یقینِ کامل عطا فرما دیں جس کے ذریعے ــــ آپ دنیا کی ہر مشکل ہم پر آسان فرما دیں۔''

اگر ہمیں یہ یقینِ قلبی حاصل ہو جائے کہ اللہ تعالیٰ مجھ سے بڑھ کر میرا خیر خواہ ہے، وہ حد درجہ مہربان ہستی ہے، تو پھر وہ ہمیں جس حال میں بھی رکھے، ہم اُس کی رضا پر راضی رہیں اور زندگی کی مشکلات و مصائب و شکوہ شکایت نہ کریں، اور ہر قسم کے حالات میں سکونِ قلبی کی دولت سے مالا مال ہوں۔ ظاہر ہے کہ جب یقین اِس بات پہ ہو کہ رب کا ہر فیصلہ میرے لئے خیر و بھلائی پر مبنی ہے، خواہ بظاہر وہ مجھے بڑی مصیبت اور تکلیف دکھائی دے، تو پھر آدمی تکلیف اور مصیبت کے تصور سے آزاد ہو جاتا ہے۔

بہر حال جو بات واضح کرنا مقصود ہے وہ یہ ہے کہ روزے کے مدعا تقویٰ ہے۔ یہ رب چاہی زندگی گزارنے کے لئے ایک تربیتی پروگرام ہے، ایک ایسی زندگی جو اللہ کی بندگی و غلامی پر مبنی ہو، اور نفس کی غلامی سے آزاد ہو، جو اللہ اور اُس کے رسول ﷺ کی اطاعت پر استوار ہو۔ تاکہ اِس کے نتیجے میں انسان آخرت کی دائمی اور حقیقی زندگی میں سرخرو ہو سکے۔ اُس ابدی زندگی میں کامیاب و کامران ہو سکے، جس کی کامیابی اصل کامیابی اور جس کی ناکامی حقیقی ناکامی و نامرادی ہے۔ مگر افسوس کہ ہم اُس زندگی کو فراموش کئے بیٹھے ہیں، اور اُن اوصاف سے عاری ہیں جو جنت میں لے جانے کا ذریعہ ہیں۔ ہم دنیا اکٹھی کرنے میں مگن ہیں اور علائق دنیوی کی بے لگام محبت میں اندھے ہو رہے ہیں۔ بیوی بچوں کی خوشنودی کے لئے اللہ کی مقرر کردہ حدود کو پامال کر رہے ہیں۔ حالانکہ اصل حقیقت یہ ہے کہ یہ دنیا، یہاں کا مال و اسباب اور یہاں کے رشتے ناتے آخرت میں ہمارے کچھ کام نہ آ سکیں گے۔ اللہ تعالیٰ کی کتاب بار بار ہمیں اِس حقیقت کی جانب متوجہ کرتی ہے۔ اِس سلسلہ میں سورۃ المعارج کی چند آیات بڑی چشم کشا ہیں۔ فرمایا:

﴿اِنَّھُمْ یَرَوْنَہٗ بَعِیْدًا ۝ وَّنَرٰىہُ قَرِیْبًا ۝﴾

''وہ (قیامت) ان لوگوں کی نگاہ میں دور ہے اور ہماری نظر میں نزدیک۔''

قیامت کے بارے میں لوگوں کا خیال ہے کہ وہ بہت بعید ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے، نہیں، قیامت دور نہیں، بہت قریب ہے، تمہارے سر پر کھڑی ہے۔ نبی اکرم ﷺ اللہ کے آخری رسول ہیں اور آپ ﷺ کی یہ امت آخری امت ہے۔ اِس کے بعد دنیا کی یہ چادر لپیٹ دی جانے والی ہے۔ قربِ قیامت کی جتنی بھی چھوٹی علامات احادیث میں بیان کی گئی ہیں، اُن میں سے اکثر و بیشتر پوری ہو چکی ہیں، لہٰذا قیامت کا آنا اب زیادہ دور کی بات دکھائی نہیں دیتی۔ احادیث کی روشنی میں کی گئی تحقیق و تفتیش کے بعد بعض علماء کا کہنا ہے کہ اِس امت کی عمر پندرہ سو سال ہے۔ چنانچہ اِس بات کا پورا امکان ہے کہ یہ صدی انسانیت کی آخری صدی ہو، اور اِس کے بعد زلزلۃ الساعۃ آ جائے اور قیامت برپا ہو جائے۔ یہ تو اجتماعی قیامت ہے، جو بہر صورت آ کر رہے گی۔ ایک

دوسری قیامت بھی ہے، جو اس سے پہلے انفرادی طور پر ہر آدمی پر آتی ہے اور وہ ہے آدمی کی موت۔ آپؐ نے فرمایا ''جو شخص مر گیا تو اس کی قیامت واقع ہو گئی۔'' کیونکہ اب اس کی مہلت عمل ختم ہو گئی، لہٰذا وہ آخرت کے لئے اپنا ذخیرۂ اعمال میں کوئی اضافہ نہیں کر سکتا۔

پس آخرت سب سے بڑی حقیقت ہے۔ قرآن ہماری توجہ بار بار اس کی جانب اسی لیے مبذول کراتا ہے، تاکہ ہم خواب غفلت سے بیدار ہو کر اُس کے لئے اعمال صالحہ کی پونجی اکٹھی کریں۔

روز قیامت پہاڑوں اور چٹانوں کی کیفیت یہ ہو گی کہ دھنکی ہوئی روئی کی طرح اُڑ رہے ہوں گے۔ چنانچہ فرمایا:

يَوْمَ تَكُوْنُ السَّمَآءُ كَالْمُهْلِ ۝ وَتَكُوْنُ الْجِبَالُ كَالْعِهْنِ ۝

''جس دن آسمان ایسا ہو جائے گا جیسا پگھلا ہوا تانبا، اور پہاڑ (ایسے) جیسے (دھنکی ہوئی) رنگین اُون''

آسمان اپنا رنگ بدلے گا۔ اور پہاڑ جن کے رنگ مختلف ہیں، جب وہ اپنی جگہ سے اکھڑ جائیں گے اور بے وزن ہو کر اڑنے لگیں گے تو ایسا دکھائی دے گا جیسے رنگ برنگ کا دھنکا ہوا اون اڑ رہا ہو۔

اُس دن انسان کی بے بسی و بے چارگی کی کیا کیفیت ہو گی، اس کا نقشہ اگلی چند آیات میں کھینچا گیا ہے۔ فرمایا:

وَلَا يَسْئَلُ حَمِيْمٌ حَمِيْمًا ۝ يُّبَصَّرُوْنَهُمْ ۭ يَوَدُّ الْمُجْرِمُ لَوْ يَفْتَدِيْ مِنْ عَذَابِ يَوْمِىِٕذٍۢ بِبَنِيْهِ ۝ وَصَاحِبَتِهٖ وَاَخِيْهِ ۝ وَفَصِيْلَتِهِ الَّتِيْ تُــــْٔوِيْهِ ۝ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا ۙ ثُمَّ يُنْجِيْهِ ۝

''اور کوئی دوست کسی دوست کا پرسان نہ ہوگا (حالانکہ) ایک دوسرے کو سامنے دیکھ رہے ہوں گے۔ گناہ گار خواہش کرے گا کہ کسی طرح اس دن کے عذاب کے بدلے میں (سب کچھ) دے دے، اپنے بیٹے اور اپنی بیوی اور اپنے بھائی اور اپنا خاندان جس میں وہ رہتا تھا، اور جتنے آدمی زمین میں ہیں غرض سب (کچھ دے دے) اور اپنے تئیں عذاب سے چھڑا لے۔''

یعنی اُس دن نفسانفسی کا عالم ہوگا۔ دنیا کے جگری دوست بھی انسان کے کام نہ آسکیں گے۔ ایک دوسرے کو مشکل میں دیکھ رہے ہوں گے، مگر کوئی دوسرے کی مدد نہ کر سکے گا۔ ہر ایک کو اپنی پڑی ہوگی۔ انسان کی ایک اور صرف ایک خواہش ہوگی کہ وہ خود کسی طریقے سے نار جہنم سے بچ جائے۔ مجرم اور گناہ گار لوگ جو دنیا میں اللہ اور آخرت کو فراموش کئے، سرکشی اور بغاوت کی زندگی بسر کر رہے تھے، جب اپنا انجام سامنے دیکھیں گے تو اُن میں سے ہر ایک یہ خواہش کرے گا کہ اے کاش! اُسے اس عذاب سے چھٹکارا مل جائے، خواہ اس کے بدلے اُس کے بیٹوں، بیوی، بھائی اور پورے کنبے قبیلے کو فدیے کے طور پر جہنم میں ڈال دیا جائے۔ مگر قرآن یہ بتاتا ہے کہ اُس کی یہ خواہش ہرگز پوری نہ ہوگی۔ چنانچہ آگے فرمایا:

كَلَّا ۭ اِنَّهَا لَظٰى ۝ نَزَّاعَةً لِّلشَّوٰى ۝ تَدْعُوْا مَنْ اَدْبَرَ وَتَوَلّٰى ۝ وَجَمَعَ فَاَوْعٰى ۝

''(لیکن) ایسا ہرگز نہیں۔ آگ ہے، کھال ادھیڑ ڈالنے والی۔ ان لوگوں کو اپنی طرف بلائے گی جنہوں نے (دین حق سے) اعراض کیا، اور (مال) جمع کیا اور بند کر رکھا۔''

آگ مجرموں اور گناہ گاروں کی تاک میں ہوگی اور اُن کی خواہش کے برعکس انہیں اُس آگ میں جھونک دیا جائے گا۔ اُس دن دوزخ کی جانب سے ایک پکار لگائی جائے گی الیّ کافر، الیّ منافق، الیّ جامع المال، یعنی ''اے کافر، اے منافق اور اے مال جمع کرنے والے ادھر آ۔'' چنانچہ دنیا میں جتنے بھی لوگ حق کا انکار کرتے تھے، دین و شریعت سے انحراف کرتے تھے اور اہل و عیال کی بے جا آسائشوں کے خیال سے حرام حلال کی تمیز کئے بغیر مال اکٹھے کرتے اور اُسے سینت رکھتے تھے، آج سب دوزخ کی طرف کھنچے چلے آئیں گے۔ دوزخ اُن کی کھال اتار کر اُن کا کلیجہ نکال باہر کرے گی۔ دراصل یہ ہے وہ دن جس دن انسان کو احساس ہوگا کہ میرا اصل مسئلہ مال و دولت اور دنیاوی سٹیٹس نہیں تھا، بلکہ عذاب جہنم سے نجات حاصل کرنا تھا۔ دنیا میں مَیں نے محض اپنی نادانی اور جہالت سے دنیائے مسائل پہاڑ بنا کر اپنے اوپر سوار کر لئے تھے، حالانکہ یہ مسائل اصل مسائل نہ تھے، اسی طرح دنیا کی راحت اصلی راحت نہ تھی، یہ سب کچھ تو محض میری آزمائش

پریس ریلیز 30 اکتوبر 2007ء

حکومت سوات میں اپنے ہی ملک کے وفادار شہریوں کے خلاف طاقت کا استعمال ترک کر کے مذاکرات کا راستہ اختیار کرے، اور نفاذ شریعت کے جائز مطالبہ کو پورا کرنے کا اہتمام کرے

حافظ عاکف سعید

سوات میں فوجی آپریشن انتہائی قابل مذمت ہے۔ ماضی میں بے شمار ممالک کو سوات جیسے معاملات سے سابقہ پڑا لیکن کہیں بھی اپنے ہی عوام پر گن شپ ہیلی کاپٹروں کے ذریعے طاقت کے استعمال کی مثال نہیں ملتی۔ یہ بات امیر تنظیم اسلامی حافظ عاکف سعید نے سوات میں فوجی کارروائی کے ردعمل کے طور پر اپنے ایک بیان میں کہی۔ انہوں نے کہا کہ سوات میں جو کچھ ہوا وہ نائن الیون کے بعد حکومت کی غلط حکمت عملی، وزیرستان اور لال مسجد کے معاملے کو غلط طریقے سے ہینڈل کرنے کا نتیجہ ہے۔ یہ بات اب کوئی راز نہیں ہے کہ اپنے ہی وفادار عوام کے خلاف فوجی کارروائیوں کا یہ سلسلہ صرف اور صرف امریکہ کے دباؤ پر اور اُسے راضی رکھنے کے لئے کیا جا رہا ہے جو ملک کو خانہ جنگی کی طرف لے جا رہا ہے۔ افسوسناک امر یہ ہے کہ دونوں طرف مسلمان ہیں اور مسلمان فوجیوں کے ہاتھوں اپنے مسلمان بھائیوں کو مروایا جا رہا ہے۔ 1971ء میں مشرقی پاکستان میں قوت کا استعمال ملک کے دولخت ہونے کی صورت میں ظاہر ہوا۔ سوات کے معاملے کو طاقت سے دبانے کا نتیجہ کیا نکلے گا یہ سوچ کر کپکپی طاری ہو جاتی ہے۔ حافظ عاکف سعید نے کہا کہ مولانا فضل اللہ اور ان کے ساتھی اس ملک کے شہری ہیں۔ وہاں کے لوگ ان کے اقدامات کی حمایت کرتے ہیں۔ اُن کا یہ مطالبہ بالکل درست ہے کہ علاقے میں شریعت کا نفاذ ہونا چاہیے، اس سے قبل حکومت نے وہاں نفاذ شریعت وعدہ کر کے پورا نہیں کیا جس کا ردعمل موجودہ صورت میں ظاہر ہوا ہے۔ لہٰذا حکومت کو یہ معاملہ طاقت کے بجائے احسن طریقے سے حل کرنا چاہیے۔ ہم ارباب اقتدار سے استدعا کرتے ہیں کہ وہ سوات میں فوری طور پر فوجی کارروائی روک کر دوسرے معروف طریقوں مثلاً مذاکرات کے ذریعے اس معاملے کو حل کرنے کی کوشش کریں اور اس کے اصل اور دیرپا حل کے طور پر نہ صرف ان کے اس جائز مطالبے کو پورا کرنے کا اہتمام کرے بلکہ پورے ملک میں شریعت الٰہی کا نفاذ اور اللہ کے دین کو قائم و نافذ کرنا ہر

تھی۔ اصل مسئلہ تو آخرت کی نجات تھی۔ لیکن اُس دن کے احساس کا کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ اُس دن کا ادراک حقیقت سوائے پچھتاوے کے اور کچھ کام نہ آ سکے گا۔ قرآن حکیم بار بار آخرت کی یاد دہانی اِسی لئے کراتا ہے تاکہ دنیا کی زندگی میں یہ حقیقت آدمی کے ذہن میں ہر وقت مستحضر رہے، اور وہ آخرت کی فلاح کے حصول کے لئے سعی و جہد کرے، اور اُس دن کے عذاب سے بچنے کی سعی کرے جب اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے لئے کئے گئے اعمال صالحہ کے علاوہ کوئی چیز انسان کو فائدہ نہ دے سکے گی۔ انسان کی توجہ بار بار اس حقیقت کی جانب دلائی جاتی ہے کہ اگر وہ آخرت کی فلاح چاہتا ہے تو دنیا پرستی اور زر پرستی کا شیوہ ترک کر دے، وہ دنیا پرستی جو اُسے آسانی ہدایت سے روگردانی پر مائل کرتی ہے، جو اُسے حلال و حرام کی تمیز کئے بغیر مال اکٹھا کرنے اور جمع کرنے پر اُکساتی ہے، جو اُسے یہ پٹی پڑھاتی ہے کہ پوش علاقے میں اُس کی عمدہ رہائش ہونی چاہیے، اُس کی اولاد کے لئے اعلیٰ اور مہنگے تعلیمی اداروں میں تعلیم کا سلسلہ ہونا چاہیے، اُس کا معاشی مرتبہ بلند ہونا چاہیے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ یہ دنیا پرستی ہلاکت کے گڑھے میں دھکیلنے والی شے ہے۔ اگر ہماری سعی و جہد اور تگ و دو کا ہدف دنیا بن گئی تو اس کا نتیجہ آخرت میں عظیم خسارہ اور ذلت آمیز رسوائی ہوگا۔ اگر اللہ کو بھول کر اور آخرت سے بے پروا ہو کر یہاں مال و دولت جمع کرنے میں لگے رہے، اور مال و دولت کو اللہ کی راہ خرچ نہ کیا، تو آخرت کی ہلاکت سے اپنے آپ کو نہ بچا سکیں گے۔

اگلی آیات میں انسان کی دنیا پرستی کا تذکرہ کیا گیا۔

﴿اِنَّ الْاِنْسَانَ خُلِقَ هَلُوْعًا ۝ اِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ جَزُوْعًا ۝ وَّاِذَا مَسَّهُ الْخَيْرُ مَنُوْعًا ۝﴾

"کچھ شک نہیں کہ انسان کم حوصلہ پیدا ہوا ہے۔ جب اسے تکلیف پہنچتی ہے تو گھبرا اٹھتا ہے اور جب آسائش حاصل ہوتی ہے تو بخیل بن جاتا ہے۔"

اللہ تعالیٰ نے انسان کو اشرف المخلوقات بنایا، اُسے بہترین ساخت پر پیدا کیا۔ اگر وہ اپنے مقام کو پہچانے تو اللہ کی نگاہ میں اُس کا مرتبہ بہت بلند ہے۔ مگر اُس کا حال یہ ہے کہ وہ بڑا کم ظرف واقع ہوا ہے۔ وہ جی کا بڑا کچا ہے۔ ذرا سا فائدہ دیکھتا ہے تو اپنا ایمان بیچ دیتا ہے۔ اُس کی نادانی کا یہ عالم ہے کہ وہ اس حقیقت کو فراموش کر کے کہ اللہ تعالیٰ نے آخرت میں اُس کے لئے بڑے بڑے انعامات اور نعمتیں تیار کر رکھی ہیں، دنیا کے حقیر فوائد کی خاطر احکام شریعت سے بغاوت کرتا ہے۔ اُسے ذرا سی تکلیف پہنچتی ہے تو بے صبرا بن جاتا ہے۔ جزع فزع کرنے لگتا ہے۔ اللہ تعالیٰ سے شکوے شکایتیں کرتا ہے۔ چیخنے چلانے لگتا ہے اور کہتا ہے کہ ہائے میری قسمت! میں تباہ ہو گیا۔ اور جب رنج و راحت کے مقابلے میں اُسے خوشی ملتی ہے، مال دولت عطا ہوتی ہے تو پھر بخیل بن جاتا ہے۔ وہ اللہ کو بھول جاتا ہے، اور اس کی راہ میں اپنا مال خرچ نہیں کرتا، بلکہ اُس پر سانپ بن کر بیٹھ جاتا ہے۔ یہ سب کچھ دراصل اُس کی دنیا پرستی اور کم ظرفی کا مظہر ہے، اور دنیا پرستی کا بنیادی سبب آخرت کو فراموش کرنا ہے۔ اِس پستی سے وہ لوگ مستثنیٰ ہیں جو درج ذیل اوصاف رکھتے ہیں۔ یعنی

﴿اِلَّا الْمُصَلِّيْنَ ۝ الَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ دَآئِمُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ فِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ ۝ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ ۝ وَالَّذِيْنَ يُصَدِّقُوْنَ بِيَوْمِ الدِّيْنِ ۝ وَالَّذِيْنَ هُمْ مِّنْ عَذَابِ رَبِّهِمْ مُّشْفِقُوْنَ ۝ اِنَّ عَذَابَ رَبِّهِمْ غَيْرُ مَاْمُوْنٍ ۝ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ ۝ اِلَّا عَلٰٓى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ ۝ فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رَاعُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ هُمْ بِشَهٰدٰتِهِمْ قَآئِمُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ ۝ اُولٰٓئِكَ فِيْ جَنّٰتٍ مُّكْرَمُوْنَ ۝﴾

"مگر نماز گزار۔ جو نماز کا التزام رکھتے (اور بلاناغہ پڑھتے) ہیں۔ اور جن کے مال میں حصہ مقرر ہے۔ (یعنی) مانگنے والے کا اور نہ مانگنے والے کا۔ اور جو روز جزا کو سچ سمجھتے ہیں۔ اور جو اپنے پروردگار کے عذاب سے خوف رکھتے ہیں۔ بے شک اُن کے پروردگار کا عذاب ہی ایسا ہے کہ اُس سے بے خوف نہ ہوا جائے۔ اور جو اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرتے ہیں، مگر اپنی بیویوں یا لونڈیوں سے کہ (اُن کے پاس جانے پر) انہیں کچھ ملامت نہیں۔ اور جو لوگ ان کے سوا اور کے خواستگار ہوں وہ حد سے نکل جانے والے ہیں۔ اور جو اپنی امانتوں اور اقراروں کا پاس کرتے ہیں۔ اور جو اپنی شہادتوں پر قائم رہتے ہیں اور جو اپنی نماز کی خبر رکھتے ہیں۔ یہی لوگ باغہائے بہشت میں عزت و اکرام سے رہیں گے۔"

[درج بالا آیات کی تشریح و توضیح پر امیر تنظیم کے بیان کی تلخیص آئندہ شمارے میں شائع کی جائے گی، ان شاء اللہ]

ان شاء اللہ العزیز ملتزم رفقائے تنظیم اسلامی کا

کُل پاکستان اجتماع

9 تا 11 نومبر 2007ء (بروز جمعہ، ہفتہ، اتوار)

فردوسی فارم، سادھوکے میں منعقد ہوگا

☆ اجتماع کا آغاز 9 نومبر (بروز جمعہ) نماز فجر سے ہوگا اور یہ 11 نومبر بروز اتوار نماز ظہر تک جاری رہے گا۔ رفقاء کو یہ ہدایت کی جاتی ہے کہ وہ 8 نومبر بروز جمعرات نماز عشاء تک اجتماع گاہ پہنچ جائیں، تاکہ وہ بروقت عشائیہ میں شریک ہو سکیں اور انہیں آرام کا موقع میسر آ سکے۔

☆ رفقاء کے لئے ہدایات:

1) نومبر سے لاہور میں رات کے وقت موسم قدرے سرد ہو جاتا ہے اس لئے شرکاء اجتماع موسم کے مطابق بستر اپنے ہمراہ ضرور لائیں۔

2) شرکاء اجتماع کو اجتماع گاہ تک پہنچانے کے لئے لاہور ریلوے اسٹیشن پر استقبالیہ کیمپ 8 نومبر کی صبح 8 بجے سے لے کر نماز عشاء تک رہے گا۔ اس کے بعد آنے والے رفقاء اپنے طور پر اجتماع گاہ میں پہنچیں گے۔

3) اپنے طور پر اجتماع گاہ پہنچنے والے رفقاء کے لئے مرید کے اور کامونکی کے درمیان سادھوکی کے مقام پر استقبالیہ کیمپ لگایا جائے گا جو کہ 8 نومبر کی صبح 8 بجے سے 9 نومبر کی صبح فجر تک قائم رہے گا۔ وہاں سے رفقاء کو اجتماع گاہ تک لے جانے کا مناسب بندوبست موجود ہوگا۔

4) اجتماعی طور پر بذریعہ بس سفر کرنے والے رفقاء کو واپسی پر لاہور سٹیشن پر پہنچا دیا جائے گا۔

(اس اجتماع میں خواتین کی شرکت کا انتظام نہیں ہے)

المعلن: ناظم اجتماع **محمد خالد**

فون دفتر: 5845090-5858212 موبائل: 0301-8642342

مولانا مودودی مرحوم اور تحریکِ اقامتِ دین

ایک شخصیاتی اور تاریخی تجزیہ

ڈاکٹر [redacted]

بانی تنظیم اسلامی

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی مرحوم کی ولادت 1903ء میں ہوئی تھی۔ (حسنِ اتفاق سے میرے والد شیخ مختار احمد مرحوم کا سنِ ولادت بھی وہی تھا۔ بہرحال یہ مناسبت تو اتفاقی تھی' اہم تر بات یہ ہے کہ میں اپنے والد مرحوم کو اپنا صلبی باپ اور مولانا مودودی کو اپنا تحریکی باپ مانتا ہوں۔)

علامہ اقبال یورپ سے 1908ء میں واپس آئے تھے ـــــ اور اس کے بعد کے دس بارہ سال کے اندر اندر ان کی ملی شاعری کا ڈنکا ہندوستان کے طول و عرض میں بج گیا تھا۔ جس کے نتیجے میں احیاءِ اسلام' اُمت مسلمہ کی نشأۃ ثانیہ' اور غلبۂ اسلام کے دوسرے دَور کی امیدوں کے چراغ دلوں میں روشن ہو گئے ـــــ تو کیسے ممکن تھا کہ ابتداءً نہ تھا اور بعد ازاں نوجوان مودودی' جو حد درجہ ذہین بھی تھا اور بے حد حساس بھی' ان جذبات و احساسات سے عاری رہ جاتا! چنانچہ اس کی شخصیت کی تعمیر کی بنیاد میں یہ جذبہ راسخ ہو گیا۔

پھر اسی جذباتی اور نظریاتی فضا میں اور علامہ اقبال کی اسی ملی شاعری کے زیر اثر مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم ایسی نابغہ شخصیت منظر عام پر آئی جس نے 1912ء سے 1920ء تک اُس فضا کی اپنی اُس نثر کے ذریعے آبیاری کی جس کے بارے میں مولانا حسرت موہانیؒ نے کہا تھا کہ ؎ ''جب سے دیکھی ابوالکلام کی نثر ☆ نظمِ حسرت میں کچھ مزہ نہ رہا!'' ـــــ الغرض مولانا موصوف نے اپنی نہایت آراستہ و پیراستہ تحریروں اور اپنے ادیبانہ اور حسنِ کلام کے مظہر خطباتِ عام کے ذریعے متذکرہ بالا کیفیات کی شدت میں گراں قدر اضافہ کیا ـــــ اور خصوصاً دو امور یعنی ''دعوتِ رجوع الی القرآن'' اور غلغلۂ جہاد کا علم بلند کیا' اور 1913ء میں بیعت کی اساس پر ''حکومتِ الٰہیہ کے قیام'' کے نصب العین کے ساتھ ایک جماعت بھی ''حزب اللہ'' کے نام سے قائم کر دی ـــــ نوجوان مودودی' جو اَب خود بھی فہم و شعور کی دولت سے مالا مال ہو چکا تھا' کے ذہن و قلب پر یہ دوسرا گہرا نقش بھی پوری پختگی کے ساتھ ثبت ہو گیا۔ اس کے بعد اگرچہ خود مولانا آزاد نے تو 1920ء میں خود اپنے قول کے مطابق علماء کے جمودِ مطلق اور خالص مقلدانہ مسلک پرستی سے مایوس ہو کر حزب اللہ کی بساط تہہ کر دی اور ''الفت کی نئی منزل'' کی جانب قدم بڑھا دیے ـــــ یعنی انگریزوں سے آزادی کے حصول کے نصب العین کے تحت کانگریس میں شمولیت اختیار کر لی اور اس طرح وہ بات پوری ہو گئی کہ ع ''پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا!'' اس لیے کہ علامہ اقبال کی اُس ملی شاعری کے زیر اثر آنے سے قبل' جسے بعض ناقدین نے ''اسلامی رومانویت'' سے تعبیر کیا ہے' نوجوان ابوالکلام بنگال کے ان نوجوان انقلابیوں کے ساتھ وابستہ تھا جو آزادیٔ ہند کے لیے زیر زمین کام کر رہے تھے ـــــ تاہم انگریزی کے اس مقولے کے مطابق کہ ''شیطان تک کو اُس کا حق ادا کرو'' میں یہ اعتراف کرتا ہوں کہ میں 1912ء سے 1920ء تک کے ابوالکلام آزاد کو اپنا تحریکی ''دادا'' مانتا ہوں۔ اگرچہ اس سے قبل اور اس کے بعد کے ابوالکلام سے مجھے کوئی کلام نہیں ہے ـــــ اور آخری بات یہ کہ میرے فکری اب اور جدّ دونوں صرف علامہ اقبال ہیں! ـــــ لیکن نوجوان مودودی نے یہ کہتے ہوئے کہ ''جس شخص سے ہمارے ہند میں اسلام کی نشأۃ ثانیہ کی امیدیں وابستہ ہوئی تھیں افسوس کہ وہ اس راہ کو تج گیا'' (روایت بالمعنیٰ) حکومتِ الٰہیہ کے قیام کے لیے جہاد فی سبیل اللہ کی دعوت کے سلسلے کو جاری رکھنے کا عزمِ مصمم کر لیا۔

ایک تیسری خفی یا خفیف نسبت نوجوان مودودی کو چودھویں صدی ہجری کے مجددِ اعظم شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ سے بایں طور حاصل ہو گئی کہ اس نے اپنی معاش کے لیے صحافت کا میدان اختیار کیا' جس کے آغاز میں وہ حضرت شیخ الہند کی وارث جماعت جمعیت علماءِ ہند کے جریدے ''الجمعیۃ'' کے ادارۂ تحریر سے وابستہ ہو گئے اور اس فضا میں حضرت شیخ الہندؒ کی جو خوشبو رچی بسی ہوئی تھی اس سے بہرہ اندوز ہوئے! ـــــ اگرچہ یہ سلسلہ بوجوہ زیادہ دیر نہ چل سکا!

ان تین اعلیٰ نسبتوں کے ساتھ مولانا مودودی نے جب اپنی تصنیفی اور تالیفی زندگی کا آغاز کیا تو اوّلاً ان کے قلم سے چوبیس سال کی عمر میں ''الجہاد فی الاسلام'' جیسی معرکۃ الآرا کتاب منصۂ شہود پر آئی' جو آج تک بھی اس موضوع پر حرفِ آخر کا درجہ رکھتی ہے۔

اسی اثناء میں دسمبر 1930ء میں ایک تاریخ ساز واقعہ پیش آیا۔ یعنی الٰہ آباد میں آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ اجلاسِ عام میں علامہ اقبال نے اپنا صدارتی خطبہ ارشاد فرمایا' جس میں انہوں نے ایک جانب تو سرسید احمد خان مرحوم نے مسلمانوں کی جس جداگانہ قومیت کا ڈنکا بجایا تھا اس کو نہایت عالمانہ اور فلسفیانہ انداز اور عمرانیات و اجتماعیاتِ انسانی کی مسلمہ اساسات پر مؤکد و مبرہن کیا اور دوسری طرف یہ پیشین گوئی بھی کی کہ ہندوستان کے شمال مغرب میں ایک آزاد مسلمان ریاست کا قیام

* تقدیرِ مبرم (DESTINY) ہے ـــــ اور اس کے ساتھ ہی یہ فرما کر مسلم لیگ کی تحریک میں ایک ''مثبت'' جذبے کا انجکشن لگا دیا کہ: ''اگر ایسا ہو گیا تو ہمیں ایک موقع مل جائے گا کہ اسلام کے چہرۂ منور پر جو بدنما داغ اور دھبے عرب ملوکیت (ARAB IMPERIALISM) کے دوران لگ گئے تھے انہیں صاف کر کے اسلام کے نظامِ عدلِ اجتماعی کی ایک روشن مثال عالمِ انسانیت کے سامنے پیش کریں!'' (جبکہ اس سے قبل تک مسلم لیگ (1906ء تا 1930ء) صرف ہندوؤں کے غلبے سے بچاؤ اور اپنے سیاسی حقوق کے تحفظ کے ''منفی'' جذبے کے تحت کام کر رہی تھی!)

1933ء میں مولانا مودودی نے اپنی آزادانہ صحافتی زندگی کا آغاز کیا' اور حیدر آباد دکن سے ماہنامہ ''ترجمان القرآن'' کی اشاعت شروع کی ـــــ تو اس میں انہوں نے دو امور کو خاص طور پر اپنا ہدف بنایا: ایک مسلمانانِ ہند کے سیاسی مسائل اور ان کے حل کے ضمن میں تبصرے اور تجزیئے' اور دوسرے مغربی تہذیب کی بڑھتی ہوئی یلغار نے اسلام کی بنیادی تعلیمات' اس کے شرعی اور فقہی نظام اور سب سے بڑھ کر اس کی تہذیبی اور ثقافتی روایات کو جو چیلنج پیش کیا تھا اس کے مقابلے میں اسلام کا دفاع' گویا ایک نئے علم الکلام کی تدوین!

مقدم الذکر امر کے ضمن میں انہوں نے ایک جانب متحدہ وطنی قومیت کے نظریے کی تردید میں زوردار مضامین اور اداریے لکھے' جو بعد میں ''مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش'' کے نام سے کتابی صورت میں شائع کیے ـــــ اور اس کے ضمن میں مثبت اور ایجابی طور پر مسلمانوں کے جداگانہ قومی تشخص کے اثبات میں علامہ اقبال کے پیش کردہ نظریے کی نہایت سلیس زبان اور دلنشین پیرائے میں وضاحت کی ـــــ جو ''مسئلہ قومیت'' کے عنوان سے کتابی صورت میں سامنے آئی ـــــ جس کی بنا پر مولانا مودودی نہ صرف یہ کہ مسلم لیگ کے حلقوں میں محبوب و مقبول ہوئے ـــــ بلکہ مسلم نوجوانوں کی آنکھ کا تارا بن گئے!

اس کے ساتھ ساتھ' مؤخر الذکر موضوع پر مولانا کے قلم سے اسلامی تہذیب کے اصول و مبادی' پردہ' تفہیمات' تنقیحات ایسی تصانیف نکل کر شائع ہوئیں' جن کی تاثیر کا اعتراف ان علماء کرام نے بھی برملا کیا جو بعض دوسرے فقہی اور کلامی مسائل میں ان سے شدید اختلاف رکھتے تھے ـــــ اور یہ تسلیم کیا کہ مسلمانوں کی جدید تعلیم یافتہ نوجوان نسل کو مغربی اثرات سے بچانے کے اہل واقعۃً وہ خود نہیں تھے بلکہ مولانا مودودی تھے!

مولانا مودودی کی ان ہی علمی کاوشوں اور ان کے اثرات سے متاثر ہو کر علامہ اقبال نے انہیں دعوت دی کہ دکن کی سنگلاخ زمین کو خیرباد کہہ کر پنجاب کی سرسبز و شاداب فضا میں ڈیرہ ڈالیں ـــــ چنانچہ 1938ء میں وہ مشرقی پنجاب کے مشہور شہر پٹھانکوٹ کے نزدیک ''سرنا'' نامی بستی میں اُس ادارہ دار الاسلام (وقف) میں مقیم ہو گئے جو علامہ اقبال ہی کے ایک عقیدت مند چودھری نیاز علی مرحوم نے قائم کیا تھا ـــــ!

لیکن اب تاریخ نے ایک نئی کروٹ لے لی۔ اور جس عظیم شخصیت نے اسلام کی علمی و فکری خدمت کے لیے موزوں ترین شخص سمجھتے ہوئے مولانا مودودی کو پنجاب منتقل ہونے کی دعوت دی تھی' اُسی کی عقابی نگاہ نے سات سمندر پار جا کر لندن میں مقیم ہو جانے والے محمد علی جناح کو تاکا۔ اور 1932ء میں تیسری گول میز کانفرنس کے موقع پر ان سے ملاقاتیں کر کے انہیں آمادہ کیا کہ ہندوستان واپس آ کر اُس ''مثبت جذبے'' کی آبیاری کی باگ ڈور سنبھالیں جس کا انجکشن انہوں نے مسلم لیگ کے جسد میں اپنے خطبہ الٰہ آباد میں لگایا تھا۔ چنانچہ وہ تشریف لائے اور انہوں نے مسلم لیگ کی کمان سنبھالی' اس کے تاحیات صدر مقرر ہوئے' اور پھر دس بارہ برس تک انہوں نے احیاءِ اسلام کی وہ ''قوالی'' گائی جس کے نتیجے میں ہندوستان کے طول و عرض میں آباد مسلمانوں کو ''حال'' آ گیا اور اس طرح محمد علی جناح اسلامیانِ ہند کے ''قائد اعظم'' بن گئے! اور رفتہ رفتہ مسلم لیگ مسلمانانِ ہند کی واحد نمائندہ جماعت کی حیثیت اختیار کر گئی۔

اس مرحلے پر مولانا مودودی نے ان خدشات کا اظہار کیا کہ مسلمانوں کی خالص ''قومی تحریک'' جس میں مؤمنوں کے ساتھ ساتھ ملحد' پابندِ صوم وصلوٰۃ لوگوں کے ساتھ ساتھ فاسق و فاجر' اور اعلیٰ پاکیزہ اخلاق و کردار کے حامل لوگوں کے ساتھ ساتھ زانی اور شرابی بھی شامل ہوں اگر ایک علیحدہ ملک حاصل کرنے میں کامیاب ہو بھی گئی تو وہاں ایک قومی ریاست تو قائم ہو سکتی ہے' اسلامی حکومت قائم نہیں ہو سکتی! چنانچہ اب انہوں نے مسلم قومیت سے آگے بڑھ کر خالص اسلامی عصبیت اور مسلمانوں کے محض ایک قوم نہیں بلکہ ''اُمت'' ہونے کے تصور کو اجاگر کرنے کا عَلَم ہاتھ میں لے لیا جس کا مقصد اللہ کے بندوں کو اللہ کے دین کی جانب دعوت و تبلیغ کا حق ادا کر کے ان پر حجت قائم کر دینا ہے تاکہ وہ قیامت کے دن یہ عذر پیش نہ کر سکیں کہ ان تک اللہ کا پیغام پہنچا ہی نہیں تھا' اور اس شہادتِ حق یا شہادت علی الناس کا تقاضا بہ تمام و کمال اس وقت پورا ہوتا ہے جب اللہ کے دین کو دنیا میں بالفعل قائم کر کے پوری نوعِ انسانی کو اس کی برکات کا مشاہدہ کرا دیا جائے تاکہ پھر ان کے لیے کسی اور نظامِ زندگی کو اختیار کرنے کا جواز باقی نہ رہ جائے!

چنانچہ اب مولانا مودودی نے نری مسلم قومیت کی اساس پر بننے والی جماعت اور اس کے تحت چلنے والی تحریک کی بجائے ''اسلامی حکومت کیسے قائم ہوتی ہے'' (اُس مقالے کا عنوان جو مولانا نے 1940ء میں اسٹریچی ہال' علی گڑھ یونیورسٹی میں پیش کیا) اور ایک نئی صالح جماعت کی ضرورت پر زوردار مضامین لکھے' جو مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش'' کے حصہ سوم کی شکل میں کتابی صورت میں طبع ہوئے ـــــ اور بالآخر جب 1940ء میں لاہور میں منعقد ہونے والے مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس نے ''پاکستان ریزولیوشن'' پاس کر کے اپنا سیاسی ہدف متعین کر لیا ـــــ تو 1941ء میں مولانا مودودی نے ''جماعت اسلامی'' کے نام سے ایک نئی جماعت قائم کر لی! جس کا نصب العین تو وہی قرار پایا جو مولانا آزاد کی حزب اللہ کا تھا' یعنی حکومت الٰہیہ کا قیام ـــــ جو بعد میں ایک خالص قرآنی اصطلاح ''اقامتِ دین'' کی شکل اختیار کر گیا ـــــ البتہ جہاں تک جماعت کی تنظیمی اساس کا تعلق ہے' اگرچہ بڑے مضبوط قرائن موجود ہیں کہ مولانا مودودی صاحب کا رجحان بھی بیعت ہی کی طرف تھا' لیکن ان کی زوردار اور مدلل دعوت پر جو حضرات جمع ہوئے تھے ان میں بعض شخصیات علم و فضل کے اعتبار سے ان سے زیادہ نہیں تو ہم پلہ ضرور تھیں' جبکہ بعض حضرات تقویٰ اور تدیّن میں ان سے بہت بڑھ کر تھے (جیسے مثلاً تقریباً ہم عمر لوگوں میں سے مولانا محمد منظور نعمانی از لکھنؤ' مولانا امین احسن اصلاحی از اعظم گڑھ' مولانا سید صبغۃ اللہ بختیاری از مدراس اور تھوڑے سے کم عمر لوگوں میں سے مولانا عبدالغفار حسن' مولانا سید ابوالحسن علی ندوی' مولانا محمد جعفر شاہ پھلواروی اور مولانا مسعود عالم ندوی وغیرہم) لہٰذا مولانا بیعت کا مطالبہ نہیں کر سکے بلکہ جماعت کی اساس مغرب سے درآمد شدہ نیم جمہوری و دستوری تصورات پر رکھ دی گئی! اگرچہ بعد میں مولانا کا یہ نظریہ کہ جماعت اسلامی کے امیر کے پاس ویٹو کا اختیار ہونا

چاہیے جماعت میں (بالخصوص 1946ء کے اجتماع الٰہ آباد کے موقع پر) شدید بحث و نزاع کا موضوع بنا اور پھر 58-1957ء میں بھی اس پر بحث و تکرار ہوئی!)

یہاں ایک بات کی وضاحت ضروری ہے ـــــ تاریخی ریکارڈ سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ علامہ اقبال بھی خالص قومی تحریک کے نتائج و عواقب کے ضمن میں وہی تحفظات رکھتے تھے جو مولانا مودودی کو تھے ـــــ چنانچہ 1932ء سے 1935ء کے درمیان علی گڑھ یونیورسٹی کے صدر شعبہ فلسفہ ڈاکٹر ظفر حسن صاحب کی تجویز' اور بعض دوسرے اہم حضرات کی تائید کی بنا پر مفصل گفت و شنید اور خط و کتابت کے بعد ''جمعیت شبان المسلمین'' کے قیام کا فیصلہ ہو گیا تھا ـــــ جس کی اساس بیعت پر قائم ہونی تھی اور حضرت علامہ نے قبول کر لیا تھا کہ وہ اس جماعت کے امیر ہوں گے اور دوسرے حضرات ان سے بیعت کریں گے اور وہ مجلس شوریٰ کی اکثریت کے پابند نہیں ہوں گے بلکہ اس کے فیصلوں کو ویٹو کر سکیں گے! ـــــ مزید برآں یہ کہ اس میں صرف ان مسلمانوں کو شامل کیا جائے گا جن کے عقائد بھی صحیح ہوں اور کردار اور اخلاق بھی اسلامی ہوں ـــــ چنانچہ طے تھا کہ کسی قادیانی کو اس میں شامل نہیں کیا جائے گا اور شرکاء کا پابند صوم وصلوٰۃ ہونا لازمی ہوگا ـــــ نیز یہ بھی طے تھا کہ یہ جماعت کسی بھی سطح کے انتخابات میں کبھی حصہ نہیں لے گی! (یہ ساری تفاصیل ڈاکٹر برہان احمد فاروقی مرحوم نے اپنی ایک تالیف میں ڈاکومنٹری ثبوتوں کے ساتھ بیان کی ہیں ـــــ ڈاکٹر صاحب کی اس تالیف کی ایک تلخیص چند سال پہلے مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور نے ''علامہ اقبال کی آخری خواہش'' کے عنوان سے شائع کر دی تھی ـــــ اور اب دستیاب ہے!) ـــــ لیکن سارا ابتدائی کام مکمل ہو جانے کے باوجود پھر یہ اسکیم سرد خانے میں کیسے چلی گئی یہ ایک عقدۂ لاینحل ہے اور تلاشِ بسیار کے بعد ایک ہی وجہ سامنے آتی ہے کہ انگریزی حکومت نے حضرت علامہ کے حاشیہ نشینوں اور ''خدمت گزاروں'' میں اپنے کچھ کارندے داخل کیے ہوئے تھے جو آخری وقت میں علامہ کو اس اقدام سے باز رکھنے میں کامیاب ہو گئے ـــــ واللہ اعلم!

حضرت علامہ کی اس ''دوعملی'' کا سبب کہ ایک جانب جناح کو لندن سے بلا کر قومی تحریک کی سربراہی سے سرفراز کیا جنہوں نے مسلم لیگ کے قافلے کو زور شور کے ساتھ متحرک بھی کر دیا ـــــ اور دوسری طرف ''جمعیت شبان المسلمین'' ایسی جماعت کی داغ بیل بھی ڈالی جس کا ذکر اوپر کیا گیا ہے' اور جو گویا کہ مسلم لیگ کا اینٹی تھیسس معلوم ہوتی ہے ـــــ یہ ہے کہ حضرت علامہ میں بیک وقت دو متضاد صلاحیتیں بہ تمام و کمال موجود تھیں۔ یعنی وہ ایک جانب اعلیٰ تصوریت پسند (IDEALIST) ذہن بھی رکھتے تھے اور دوسری جانب انہیں خالص معروضی اور واقعی حقائق کا ادراک و شعور بھی بہ تمام و کمال حاصل تھا۔ گویا وہ اعلیٰ درجہ کے REALIST اور PRAGMATIST بھی تھے۔ چنانچہ انہوں نے محسوس کیا کہ ایک ذہنی و فکری انقلاب' پھر عملی و اخلاقی تبدیلی' پھر اس کا کسی معاشرے میں اس درجہ قوی ہو جانا کہ اس کے مقابل میں کوئی دوسرا نظام ٹھہر نہ سکے ایک نہایت طویل جدوجہد کا متقاضی تھا ـــــ جبکہ ادھر حال یہ تھا کہ برٹش انڈیا میں سیاسی تبدیلیوں کے عمل کی رفتار اس قدر تیز تھی کہ ''تا تریاق از عراق آوردہ شود مار گزیدہ مردہ شود'' یعنی اگر ایک بار ہندوستان میں جدید وطنی قومیت کے اصول کے تحت ایک سیکولر نیشن اسٹیٹ قائم ہو جاتی جس میں بلا لحاظ نسل و مذہب ہر انسان کو ایک ووٹ کا حق حاصل ہو تو ـــــ پھر ہند میں اسلام کے ایک نظامِ عدلِ اجتماعی کی حیثیت سے قیام کی اُمید تو منقطع ہو ہی جانی تھی ـــــ کیا عجب کہ ہندوستان سے اسلام اور مسلمانوں کا خاتمہ ہی ہو جاتا۔ (واضح رہے کہ یہ الفاظ قائداعظم مرحوم نے 16 اپریل 1946ء کو حبیبیہ ہال لاہور میں منعقدہ ایک اجلاسِ خواتین میں کہے تھے ـــــ کہ ''اگر خدانخواستہ ہم حصولِ پاکستان میں ناکام ہو گئے تو ہندوستان سے اسلام اور مسلمانوں کا نام و نشان مٹ جائے گا!'' ـــــ اور یہ معلوم ہے کہ قائداعظم ہرگز جذبات سے کھیلنے والے گرما گرم الفاظ استعمال کرنے کے عادی نہیں تھے!)

بہرحال میرے نزدیک جو نقشہ 36-1935ء میں علامہ اقبال کی سربراہی میں بن رہا تھا اس سے بہت حد تک مشابہ واقعی تعمیر مولانا مودودی نے 1941ء میں شروع کی۔ جس کے خدوخال میں سوائے نظامِ بیعت کے باقی سب کچھ تقریباً وہی تھا جو مجوزہ ''انجمن شبان المسلمین'' کے لیے طے کیا گیا تھا۔

قصہ مختصر ـــــ 41-1940ء سے 1947ء تک یہ دونوں قافلے علیحدہ علیحدہ سفر کرتے رہے اور اگرچہ بعض مواقع پر مولانا مودودی نے مسلم لیگ اور تحریک پاکستان پر سخت تنقیدیں بھی کیں' جن کے ضمن میں نوائے وقت کے بانی و مدیر حمید نظامی مرحوم نے ایک مشہور ادارتی نوٹ بھی ''مولانا مودودی کی خدمتِ بابرکت میں!'' کے عنوان سے شائع کیا ـــــ لیکن مآل کار کے طور پر ایک جانب مسلم لیگ نے قائداعظم کی ولولہ انگیز قیادت میں پاکستان حاصل کر لیا' جو اگرچہ کانگریس اور انگریزوں کی سازش کے نتیجے میں کسی قدر لولا لنگڑا تھا ـــــ (اور ان دونوں قوتوں کو یہ یقین بھی حاصل تھا کہ یہ نوزائیدہ مملکت بہت جلد ختم ہو جائے گی!) ـــــ تاہم تائید ایزدی سے معجزانہ طور پر پاکستان لیلۃ القدر میں جو شب جمعہ بھی تھی ''نازل'' ہو گیا' ـــــ اور دوسری طرف مولانا مودودی اپنی سخت محنت و مشقت اور دن رات کی عرق ریزی اور کدوکاوش سے اور علماء کرام کی جانب سے شدید مخالفت کے باوجود ایک خالص ''اسلامی جماعت'' قائم کرنے میں کامیاب ہو گئے' جو اگرچہ تعدادِ نفوس کے اعتبار سے تو بہت مختصر تھی یعنی ہندوستان کے پورے طول و عرض میں غالباً صرف چھ صد اشخاص' جن میں سے نصف پاکستان کے حصے میں آئے' لیکن اس کے وابستگان میں دین و مذہب سے عملی وابستگی بھی اظہر من الشمس تھی اور اقامت دین کی جدوجہد کے لیے قربانی کا جذبہ ـــــ اور عمل کا جوش و خروش بھی بہ تمام و کمال شامل تھا ـــــ مزید برآں جماعتی ڈسپلن کی پابندی بھی معیاری تھی اور باہمی اخوت و محبت کا جذبہ بھی فراواں تھا ـــــ اور میں آج بھی اپنی اس رائے پر جازم ہوں جو میں نے 1956ء میں جماعت کی بعد از آزادی پالیسی سے اختلاف کے اظہار کے لیے لکھے گئے بیان میں ظاہر کی تھی (جو اَب ''تحریک جماعت اسلامی: ایک تحقیقی مطالعہ'' کی صورت میں طبع شدہ موجود ہے) یعنی یہ کہ جماعت اسلامی کی تحریک اپنے اس دور میں قرونِ اولیٰ کے بعد مسلمانوں کی پوری تاریخ کی واحد تحریک تھی جو منہج نبویؐ سے نوے پچانوے فیصد مشابہ تھی!

لیکن افسوس صد افسوس کہ ع ''خوش درخشید و لے شعلۂ مستعجل بود'' کے مصداق قیام پاکستان کے بعد کے بعض اقدامات نے اس تحریک کی نوعیت ہی کو بدل کر رکھ دیا۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ قیامِ پاکستان کے فوراً بعد مولانا مودودی نے دو اہم کام کیے۔ ایک نہایت درست اور دوسرا اسی قدر غلط! درست اقدام یہ تھا کہ مولانا دستورِ اسلامی کے نفاذ کے مطالبے کی تحریک ایک نہایت منظم شکل میں لے کر کھڑے ہوئے جس میں جملہ دینی و مذہبی حلقوں پر مستزاد خود مسلم لیگ میں شامل دینی شخصیات یعنی علماء و مشائخ

اور عام مخلص اسلام پسند کارکنوں نے جماعت سے بھرپور تعاون کیا۔ اس لیے کہ اس وقت تک جماعت اسلامی معروف معنی میں سیاسی جماعت نہیں تھی جس پر حرصِ اقتدار کی ''تہمت'' لگائی جاسکے اور اس تحریک اور مہم کے نتیجے میں بالآخر 1949ء میں ''قراردادِ مقاصد'' پاس ہوگئی جس نے گویا کہ پاکستان میں نظامِ خلافت کے دستوری ڈھانچے کی پہلی اینٹ رکھ دی ـــــ اور پھر جب کچھ سیکولر مزاج لوگوں نے اعتراضات کرنے شروع کیے کہ یہاں کون سا اسلام نافذ ہوگا؟ شیعہ کا یا سنی کا اور دیوبندی کا یا بریلوی کا ؟ تو دینی و مذہبی قوتوں کا وہ یادگار اتحاد سامنے آیا جس کے ذریعے 1950ء میں جملہ دینی مسالک کی اعلیٰ ترین قیادت نے بالاتفاق دستورِ پاکستان کے لیے بائیس نکات پیش کر کے مخالفانہ پروپیگنڈے کے غبارے کی ہوا نکال دی۔ کاش کہ جماعت اسلامی اسی فضا کو جاری رکھتے ہوئے بلکہ آگے بڑھاتے ہوئے ملک میں دوسرے دینی و مذہبی حلقوں کے تعاون کے ساتھ نفاذِ اسلام کے لیے عوامی دباؤ میں اضافہ کراتی چلی جاتی۔ اور اس طرح گویا جدید اصطلاح میں پریشر گروپ کا رول ادا کرتی رہتی ـــــ اور اس دوران میں مولانا مودودی مرحوم نے جو طریق کار ''اسلامی حکومت کیسے قائم ہوتی ہے'' میں بیان کیا تھا اس کے مطابق اسلامی انقلاب کے اساسی لوازمات یعنی ذہنی و فکری انقلاب اور اخلاقی و عملی تبدیلی کی جدوجہد کو جاری رکھتی ـــــ جس کے نتیجے میں لازماً اس کا اپنا تنظیمی قاعدہ (BASE) بھی وسیع سے وسیع تر ہوتا چلا جاتا اور مستقبل میں کسی عوامی تحریک (MASS MOVEMENT) کے لیے ''آئی جے آئی'' اور ''ایم ایم اے'' کی قسم کے انمل بے جوڑ اتحادوں کی ضرورت نہ پیش آتی ـــــ لیکن اس کے لیے لازم تھا کہ وہ ابتداء ہی میں بانگ دہل اعلان کر دیتی کہ ہم اقتدار کے طالب نہیں ہیں (گویا کہ جدید اندازِ گفتگو کے مطابق: ''ہم اسلام چاہتے ہیں' اسلام آباد نہیں!) اور پھر پوری استقامت کے ساتھ اس پر عمل پیرا بھی رہتی' چنانچہ کسی بھی سطح پر کبھی بھی کسی انتخابات میں حصہ نہ لیتی ـــــ اس صورت میں دینی مزاج اور جذبہ رکھنے والے اور احیاءِ اسلام کے لیے دل سے خواہش مند عوام تو جماعت میں بالفعل شامل ہوتے چلے جاتے اور دیگر جملہ مذہبی حلقے اور ادارے بھی اگر برملا سپورٹ نہ کرتے' تب بھی کم از کم اعلانیہ مخالفت بھی نہ کر سکتے! ـــــ لیکن ہوا اس کے بالکل برعکس! ـــــ یعنی ''پھر ان چراغوں میں روشنی نہ رہی!'' کے مصداق 1951ء میں مولانا مودودی اور جماعت اسلامی نے دوسرا قدم اٹھایا جو انتہائی غلط اور تباہ کن تھا' یعنی یہ کہ ''انقلاب قیادت'' کا نعرہ لگا کر ملک کی قومی انتخابی سیاست کے اکھاڑے میں چھلانگ لگا دی۔ اور اپنے اس اقدام کے بعد چونکہ جماعت ایک ''اصولی' اسلامی' انقلابی جماعت'' کی بجائے ''اسلام پسند' قومی' سیاسی جماعت'' بن گئی لہٰذا اب گویا وہ ملک کے دوسرے دینی اور سیاسی حلقوں کے مدِ مقابل آ گئی ـــــ تو باہمی اتحاد اور تعاون کی جگہ باہمی رسہ کشی نے لے لی' بالخصوص جماعت اسلامی اور ان دینی و مذہبی جماعتوں کے مابین تو شدید محاذ آرائی بھی پیدا ہوگئی جو پنجاب میں پہلے صوبائی انتخابات میں جماعتِ اسلامی کے حصہ لینے اور چاروں شانے چت ہونے کے مشاہدے کے بعد اس خیال سے اس میدان میں داخل ہوگئیں کہ قوم کا سوادِ اعظم تو ہمارے نظریات کا حامل ہے تو کیوں نہ ہم قسمت آزمائی کریں اس لیے کہ بقولِ غالب ؎

کیا فرض ہے کہ سب کو ملے ایک سا جواب
آؤ نا ہم بھی سیر کریں کوہِ طور کی!

اور اس کے نتیجے میں ایک جانب مسلک پرستی میں شدت پیدا ہوتی گئی۔ دوسری جانب فرقہ وارانہ کشمکش بلکہ محاذ آرائی میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔

دوسری طرف جیسے سورۃ الاعراف میں مذکور ہے کہ ایک عابد و زاہد شخص نے جسے اللہ نے کرامات سے بھی نوازا تھا اپنی روش بدل لی تو قرآن کے الفاظ میں ''شیطان اس کے پیچھے لگ گیا'' اور اسے صراطِ مستقیم سے دور سے دور تر دھکیلتا چلا گیا ـــــ ویسے ہی شیطانِ اکبر یعنی عزازیل کے انسانوں میں سب سے بڑے ایجنٹ یہود کا آلۂ کار امریکہ (جسے آیت اللہ الخمینی نے ''شیطانِ بزرگ'' کا خطاب دیا) پاکستان کے پیچھے لگ گیا۔ چنانچہ پہلے قائداعظم کے دستِ راست نواب زادہ لیاقت علی خان کو اوّلاً قراردادِ مقاصد کے منظور کرانے کی سزا کے طور پر' اور ثانیاً اپنے امریکہ کے دورے کے موقع پر یہودیوں کی ایک بڑی کانفرنس کی جانب سے اس پیشکش کو ٹھکرانے کے جرمِ عظیم کی پاداش میں کہ پاکستان اسرائیل کو تسلیم کر لے تو ہم اس کی ہر طرح مدد کریں گے 'شہید کرا دیا گیا۔ (لندن سے جاری ہونے والے ماہنامے ''IMPACT'' نے چند سال قبل وہ الفاظ نقل کیے تھے جو خان لیاقت علی خان نے یہودیوں کی اس پیشکش کے جواب میں کہے تھے' یعنی: "OUR GENTLEMEN! SOULS ARE NOT FOR SALE" اور بعد ازاں جب جماعت اسلامی اور مخلصین مسلم لیگ کے تعاون سے پاکستان کے اسلامی دستور کے کچھ مزید پہلو ابھرتے نظر آئے تو اوّلاً انگریزی استعمار کے بعض قدیم کارندوں کے ذریعے دستور اور دستوریہ دونوں کا بستر لپٹوا دیا گیا ـــــ اور پھر جنرل ایوب خان کو امریکہ کے دورے کی دعوت دے کر وہاں اس کی پیٹھ ٹھونک دی گئی کہ پاکستان کی عوامی سیاست کی بساط ایک دم لپیٹ کر مارشل لاء لگا دے ـــــ اور اس طرح 1958ء میں پاکستان کی دستوری اور حکومتی گاڑی پٹڑی سے اتر گئی!

اس دن کے بعد سے آج کے دن تک لگ بھگ پچاس سالوں کے دوران میں پاکستان کی قومی سیاست تو ایک مسموم دائرے (VICIOUS CIRCLE) میں گھومتی رہی' کہ اکثر اوقات خالص فوجی حکومت قائم رہی' اور اس کے دوران میں وقفے وقفے سے وڈیروں' جاگیرداروں' سرمایہ داروں اور بیوروکریسی کو موقع دیا جاتا رہا کہ کچھ دیر کے لیے فوج کی بالادستی کے سائے میں بظاہر سول اور نام نہاد جمہوری حکومتیں بناتے رہیں۔ چنانچہ ایک فوجی ڈکٹیٹر آتا اور بڑی آن بان اور شان کے ساتھ' نہایت بلند بانگ عزائم اور خوشنما و خوشحال مستقبل کی نوید سناتے ہوئے حکومت شروع کرتا۔ اور چند سال بعد جب وہ اپنے جملہ وعدوں کی عدم تکمیل میں ناکام رہنے کے باعث عوام کی نظروں میں DISCREDIT ہو جاتا تو ''بحالیٔ جمہوریت'' کی تحریکیں شروع ہوتیں اور عارضی طور پر سول حکومت قائم ہو جاتی جسے پھر کچھ عرصہ کے بعد کوئی فوجی آمر ختم کر کے مسموم دائرے کے اگلے راؤنڈ کا آغاز کر دیتا!

اس پچاس سالہ عرصے کے دوران میں دینی حلقوں اور مذہبی و سیاسی جماعتوں کا کردار بھی بشمول جماعت اسلامی نہایت مایوس کن رہا۔ چنانچہ انہوں نے کبھی قیامِ نظامِ اسلامی اور نفاذِ شریعت کے لیے خالص دینی اتحاد کی صورت میں کوئی عوامی تحریک نہیں چلائی (صرف ایک تحریک ختم نبوت اس میں واحد استثناء ہے' لیکن وہ خالص اعتقادی مسئلے پر اٹھی تھی' اس کا اسلام کے عملی نفاذ سے کوئی تعلق نہیں تھا) یہاں تک کہ آمرِ اوّل جنرل ایوب خان نے عائلی قوانین کے ضمن میں بدنامِ زمانہ آرڈیننس جاری کیا تو

اگرچہ ملک کے جملہ دینی طبقات نے اسے غلط قرار دیا لیکن اس کے لیے کوئی عوامی تحریک نہیں چلائی گئی ـــــ البتہ بحالیٔ جمہوریت کے لیے اٹھنے والی تحریکوں کو قربانی کا سب سے بڑا ایندھن مذہبی جماعتوں کے کارکنوں نے ہی فراہم کیا' اگرچہ اس سے ان کے ہاتھ پلے کبھی کچھ نہ آیا ـــــ اور جب بھی عارضی طور پر جمہوریت بحال ہوتی تو وہ خالص سیکولر ہی ہوتی!

اس عرصے کے دوران میں مذہبی جماعتیں انتخابات میں بھی حصہ لیتی رہیں' لیکن آپس کی رسّہ کشی اور باہم دست و گریبان رہنے کے باعث ان کے ذریعے انہیں اقتدار میں کوئی مؤثر حصہ کبھی حاصل نہ ہو سکا۔ البتہ اب سے پانچ سال قبل جب چھ مذہبی سیاسی جماعتوں کا اتحاد ''ایم ایم اے'' کے نام سے وجود میں آیا تو کچھ اس اتحاد کی برکت سے لیکن زیادہ تر افغان جہاد کی ہم نوائی کے اثرات کے باعث ڈیڑھ صوبائی حکومتیں ان کی بنیں ـــــ لیکن آج پانچ سال کے بعد نہ صرف یہ کہ ان کی کارکردگی کا خانہ خالی نظر آ رہا ہے بلکہ حال ہی میں ان کے اتحاد و اتفاق کا بھانڈا جس مکروہ صورت میں پھوٹا ہے اس نے توقع ''اِس عاشقی میں عزتِ سادات بھی گئی!'' کی صورت پیدا کر دی ہے۔ اور اگرچہ ''پیرانِ کلیسا'' کی دعا تو یہ ہے کہ اس کی موت ٹل جائے لیکن تقدیر اس کے برعکس ''مبرم'' نظر آ رہی ہے۔

راقم الحروف 1932ء میں پیدا ہوا ـــــ اپنے ہائی اسکول کی تعلیم کے آخری دو سالوں کے دوران میں تحریک پاکستان کا ادنیٰ کارکن اور حصار ڈسٹرکٹ مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن کا جنرل سیکرٹری رہا ـــــ قیامِ پاکستان کے فوراً بعد سولہ سال کی عمر میں مَیں نے جماعت اسلامی کے ''حلقہ ہمدردان'' میں شمولیت اختیار کی اور گورنمنٹ کالج لاہور میں ایف ایس سی کے دو سالوں کے دوران محلہ کرشن نگر کے حلقہ ہمدردان میں کام کرتا رہا جہاں میں اپنے ایک عزیز کے مکان میں رہائش پذیر رہا ـــــ میڈیکل کالج لاہور میں داخلے کے ساتھ ہی میں ہاسٹل میں بھی شفٹ ہو گیا اور اب میرا تعلق اسلامی جمعیت طلبہ سے ہوا' جس میں مَیں نے میڈیکل کالج کے پانچ سالوں کے دوران میں بھرپور فعال طور پر کام کیا' چنانچہ کچھ عرصہ اس کا آل پاکستان ناظمِ اعلیٰ بھی رہا ـــــ اس دوران میں میرا مولانا مودودی مرحوم سے بہت قریبی رابطہ رہا اور میں ان کی شفقتوں سے بھرپور طور پر استفادہ کرتا رہا ـــــ! جس کی خوشگوار یادیں میری زندگی کا قیمتی اثاثہ ہیں!

1954ء میں راقم میڈیکل تعلیم کی تکمیل کے بعد جمعیت سے مستعفی اور جماعت میں شامل ہوا۔ اس وقت تک میرے ذہن میں جماعت اسلامی کے انتخابی سیاست کے میدان میں داخلے کے فیصلے سے متعلق تحفظات پیدا ہو چکے تھے ـــــ لیکن میرا گمان غالب یہ تھا کہ اپنی اُس تحریر کے بموجب جو ستمبر 1948ء کے ''ترجمان القرآن'' میں شائع ہوئی تھی مولانا جلد ہی اپنے فیصلے پر نظرِ ثانی فرما لیں گے ـــــ وہ تحریر درج ذیل ہے:

''واضح طور پر سمجھ لیجیے کہ یہاں اسلامی نظام کا قیام صرف دو طریقوں سے ممکن ہے:

ایک یہ کہ جن لوگوں کے ہاتھ میں اس وقت زمامِ کار ہے وہ اسلام کے معاملہ میں اتنے مخلص اور اپنے اُن وعدوں کے بارے میں جو انہوں نے اپنی قوم سے کیے تھے اتنے صادق ہوں کہ اسلامی حکومت قائم کرنے کی جو اہلیت اُن کے اندر مفقود ہے اسے خود محسوس کر لیں اور ایمانداری کے ساتھ یہ مان لیں کہ پاکستان حاصل کرنے کے بعد ان کا کام ختم ہو گیا ہے اور یہ کہ اب یہاں اسلامی نظام تعمیر کرنا ان لوگوں کا کام ہے جو اس کے اہل ہوں۔ اس صورت میں معقول طریق کار یہ ہے کہ پہلے ہماری دستور ساز اسمبلی اُن بنیادی امور کا اعلان کرے جو ایک غیر اسلامی نظام کو اسلامی نظام میں تبدیل کرنے کے لیے اصولاً ضروری ہیں (جنہیں ہم نے اپنے ''مطالبہ'' میں بیان کر دیا ہے) پھر وہ اسلام کا علم رکھنے والے لوگوں کو دستور سازی کے کام میں شریک کرے اور ان کی مدد سے ایک مناسب ترین دستور بنائے' پھر نئے انتخابات ہوں اور قوم کو موقع دیا جائے کہ وہ زمامِ کار سنبھالنے کے لیے ایسے لوگوں کو منتخب کرے جو اس کی نگاہ میں اسلامی نظام کی تعمیر کے لیے اہل ترین ہوں۔ اس طرح صحیح جمہوری طریق پر اختیارات اہل ہاتھوں میں بسہولت منتقل ہو جائیں گے اور وہ حکومت کی طاقت اور ذرائع سے کام لے کر پورے نظامِ زندگی کی تعمیر جدید اسلامی طرز پر کر سکیں گے۔

دوسرا طریقہ یہ ہے کہ معاشرے کو جڑ سے ٹھیک کرنے کی کوشش کی جائے اور ایک عمومی تحریک اصلاح کے ذریعہ سے اس میں خالص اسلامی شعور و ارادہ کو بتدریج اس حد تک نشوونما دیا جائے کہ جب وہ اپنی پختگی کو پہنچے تو خود بخود اس سے ایک مکمل اسلامی نظام وجود میں آ جائے۔

ہم اس وقت پہلے طریقہ کو آزما رہے ہیں --- لیکن اگر خدانخواستہ ہمیں اس میں ناکامی ہوئی --- (تو) اس صورت میں ہم پھر دوسرے طریقہ پر کام شروع کر دیں گے' جس طرح پاکستان بننے سے پہلے کر رہے تھے''۔

یہی وجہ ہے کہ جب نومبر 1954ء میں جبکہ مولانا ملتان جیل میں نظر بند تھے میں جماعت اسلامی منٹگمری کے چند رفقاء کی معیت میں مولانا سے ملاقات کے لیے حاضر ہوا اور وہاں میں نے چند منٹ خلوت میں گفتگو کے لیے مانگ کر مولانا سے ایک سوال کیا ـــــ کہ ''کیا آپ ابھی اس نئے طریق کار سے مایوس نہیں ہوئے؟'' تو مولانا کا مختصر جواب یہ تھا کہ ''تا حال میں اس کے لیے دروازے بند نہیں پا رہا!'' ـــــ تاہم میرے تحفظات برقرار رہے اور جب نومبر 1955ء میں جماعت کے آل پاکستان اجتماع منعقدہ لیاری میدان کراچی میں حاضری ہوئی تو معلوم ہوا کہ جماعت کے اور بھی بہت سے ارکان ان ہی خطوط پر سوچ رہے ہیں ـــــ اس موقع پر مولانا نے جماعت کی پالیسی سے اختلاف رکھنے والے ارکان کی آراء کے جائزہ کے لیے ایک ''جائزہ کمیٹی'' بنا دی جس نے ایک سال کے عرصے کے دوران پورے پاکستان کا دورہ کر کے اپنی رپورٹ نومبر 1956ء میں شوریٰ کو پیش کر دی ـــــ (اس جائزہ کمیٹی کے سامنے میں نے زبانی ہی اظہارِ خیال کیا تھا' لیکن اس کی اس فرمائش پر کہ میں اپنے خیالات تحریری طور پر پیش کر دوں' میں نے پندرہ روز کے اندر اندر ایک مفصل بیان پیش کر دیا تھا' جو دس سال بعد 1966ء میں ''تحریک جماعت اسلامی: ایک تحقیقی مطالعہ'' کے نام سے کتابی صورت میں طبع ہوا۔)

اس رپورٹ کے پیش ہونے پر جماعت کی مرکزی شوریٰ میں ہنگامی صورت حال پیدا ہو گئی اور شوریٰ واضح طور پر دو حصوں میں بٹ گئی' اور پھر اس کے بعد کے دو تین ماہ کے دوران جو ناگفتہ بہ حالات جماعت کی اعلیٰ ترین سطح پر پیدا ہوئے ان کی یاد بھی سوہانِ روح ہے ـــــ تاہم میں نے بعد میں تحریک جماعت اسلامی کی تاریخ سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے اس پورے مواد کو بھی جمع کر کے: ''تاریخ جماعت اسلامی کا ایک گم شدہ باب'' کے عنوان کے ساتھ کتابی صورت میں شائع کر دیا تھا ـــــ بہرحال اس صورت حال سے عہدہ برآ ہونے کے لیے فروری 1957ء میں ماچھی گوٹھ (صادق آباد)

میں ایک اجتماع ارکان منعقد ہوا‘ جس کے بعد نہ صرف یہ کہ جماعت اسلامی کی اُس وقت کی ٹاپ کی قیادت کا بہت قابل لحاظ حصہ جماعت سے علیحدہ ہوا بلکہ ایک سو کے قریب عام ارکان نے بھی علیحدگی اختیار کر لی جن میں سے ایک میں بھی تھا۔ تاہم اس کے بعد بھی مجھے یہ توقع رہی کہ مولانا اپنی رائے تبدیل کرلیں گے‘ چنانچہ جب 1962ء میں حج کے موقع پر میں نے مولانا مرحوم سے پہلے مکہ مکرمہ اور منیٰ اور اس کے بعد مدینہ منورہ میں بھی ملاقات کی تو ان سے وہی 1954ء والا سوال دوبارہ کیا کہ ــــــ ’’کیا آپ ابھی تک اس پالیسی سے مایوس نہیں ہوئے؟‘‘ تو ان کا جواب بھی وہی پہلے والا تھا!

اس کے ایک طویل عرصہ کے بعد میرے علم میں بواسطہ مولانا وصی مظہر ندوی مرحوم جو جماعت کی مرکزی شوریٰ کے رکن تھے‘ یہ اطلاع آئی کہ 1970ء کے انتخابات کے نتائج سامنے آنے پر مولانا کی رائے تبدیل ہوگئی اور انہوں نے شوریٰ میں شرکت کر کے وہاں اپنا یہ خیال پیش کیا: ’’میری رائے میں پاکستان میں انتخابی عمل میں شرکت کے ذریعے اسلامی نظام کا قیام ممکن نہیں ہے اور ہمیں دوسرا راستہ اختیار کرنا چاہیے‘‘۔ جس پر شوریٰ کے بعض اراکین نے پورے زور شور کے ساتھ مولانا کی رائے کی مخالفت کی اور بعض نوجوان ارکان نے تو گستاخانہ لہجہ بھی اختیار کیا ــــــ جس پر بقول مولانا ندوی مرحوم مولانا مودودی ’’بھنا کر اٹھے‘‘ اور یہ فرما کر کہ: ’’جو دلیلیں آپ لوگ آج میرے سامنے پیش کر رہے ہیں وہ سب میں نے ہی آپ لوگوں کو پڑھائی تھیں۔ تاہم میری اب جو رائے بنی ہے وہ میں نے پیش کر دی ہے‘ آگے آپ جانیں اور آپ کا کام!‘‘ غصے کے عالم میں رخصت ہوگئے ــــــ اس پر میرے دل میں امید کا ایک چراغ روشن ہوتے ہی فوراً گل ہوگیا‘ اس لیے کہ میرے علم میں تھا کہ اب مولانا پیرانہ سالی اور گوناگوں عوارض کے جس نرغے میں ہیں اس کے باعث ان کا خود جماعت کی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ کر سٹیرنگ اپنے ہاتھ میں لینے کا کوئی امکان نہیں ہے! گویا ع ’’جب آنکھ کھلی گل کی تو موسم تھا خزاں کا!‘‘ ــــــ بعد میں جب میں نے اس وقعہ کا ذکر بعض لوگوں سے کیا اور اس پر جماعت کے حلقوں کی جانب سے شدت کے ساتھ تردید کی گئی کہ ایسا کوئی واقعہ نہیں ہوا تو وقتی طور پر میں بھی مذبذب ہوگیا تھا ــــــ لیکن پھر 1979ء کے ماہِ ستمبر میں جب مولانا مودودی کا انتقال بفلو (امریکہ) میں اپنے دوسرے صاحبزادے ڈاکٹر احمد فاروق کے پاس ہوا‘ اور چونکہ میں اُس وقت اپنی امریکہ کی پہلی وِزٹ کے سلسلے میں امریکہ میں ہی تھا تو ان کے جنازے میں شرکت کے لیے بفلو گیا تو ڈاکٹر احمد فاروق صاحب سے ملاقات ہوئی اور انہوں نے نہ صرف یہ کہ میرا پرجوش اور محبت آمیز استقبال کیا بلکہ مولانا کی نماز جنازہ کی امامت بھی مجھ سے کرائی اور اس کے ساتھ ساتھ چونکہ میں ٹورنٹو (کینیڈا) سے بار بار فون کے ذریعے ملاقات کی خواہش کا اظہار کر چکا تھا لہٰذا یہ بھی فرمایا کہ: ’’ابا جان بھی آپ سے ملاقات کے بہت خواہش مند تھے لیکن ڈاکٹروں کی جانب سے ملاقات کی اجازت نہیں تھی‘‘۔ تو میرے اندر ہمت پیدا ہوئی اور میں نے اگلے سال 1980ء میں دوسرے سفرِ امریکہ کے موقع پر بفلو کا خصوصی سفر صرف ڈاکٹر احمد فاروق سے ملاقات کے لیے کیا اور اب جو مفصل گفتگو ہوئی تو مجھے مِن جملہ دیگر بہت سے سوہانِ روح واقعات کے علم پر مستزاد مولانا ندوی مرحوم کی روایت کی بھی پوری توثیق حاصل ہوگئی!۔

بہرحال اس پورے عرصے کے دوران میں بحمد اللہ میں معطل نہیں رہا تھا‘ بلکہ جیسے 1920ء میں مولانا آزاد سے مایوس ہو جانے کے بعد نوجوان مودودی نے فوراً فیصلہ کر لیا تھا کہ اب اقامتِ دین کی اس تحریک کی باگ ڈور وہ خود سنبھالیں گے اور پھر بیس سال تک ابتدائی کام مکمل کر کے 1941ء میں جماعت اسلامی قائم کر دی تھی اسی طرح میں نے صرف چند سال ان بزرگ رہنمایانِ جماعت کا انتظار کرنے کے بعد جو اُس زمانے میں جماعت سے علیحدہ ہوئے تھے‘ کہ وہ قدیم طریق کار پر عمل پیرا کوئی نیا تنظیمی ڈھانچہ قائم کر دیں گے‘ ان کی اس سلسلے میں سہل انگاری اور غیر سنجیدگی سے بھی مایوس ہو کر فیصلہ کر لیا تھا کہ اب میں خود اس تحریک کے احیاء کی سعی کروں گا ــــــ اور پھر سات سال تک لاہور میں بغیر کسی تنظیمی ڈھانچے کے حلقہ ہائے مطالعہ قرآن اور مجالسِ دروسِ قرآن کے انعقاد اور خطباتِ جمعہ وغیرہ کے ذریعے زمین ہموار کرنے کے بعد میں نے بھی 1972ء میں مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور‘ اور 1975ء میں تنظیم اسلامی قائم کر دی جس میں جماعت اسلامی کے تأسیسی نظریات کے ساتھ بعض تنظیمی نکات ’’حزب اللہ‘‘ اور ’’انجمن شبان المسلمین‘‘ کے بھی شامل ہیں!

قصہ مختصر! اب پورے پچاس سال کے بعد ع ’’روحِ مسلماں میں ہے آج وہی اضطراب!‘‘ کے مصداق جماعت اسلامی کے ارکان کا ایک آل پاکستان اجتماع (دوسرا ماچھی گوٹھ) 2 تا 4 نومبر منعقد ہو رہا ہے ــــــ مجھے یہ تو اندازہ نہیں ہے کہ اِس وقت اختلافی نکات کون سے ہیں‘ تاہم امید ہے کہ اس موقع پر بھرپور انداز میں جماعت اسلامی کے ماضی و حال کا جائزہ لیا جائے گا۔ چنانچہ ماضی میں اختلاف کرنے والوں کی آراء اور ان میں سے بعض (جیسے خود راقم الحروف اور برادرم ارشاد احمد حقانی) کی موجودہ حالات میں تجاویز اور مشوروں پر بھی غور کیا جائے گا! ــــــ اور اس کے نتیجے میں کیا عجب کہ ع ’’دوڑ پیچھے کی طرف اے گردشِ ایام تو!‘‘ کا فیصلہ ہو جائے ــــــ اور جماعت اسلامی کی یہ ’’تحریکی توبہ‘‘ اسلامیانِ پاکستان کی ’’اجتماعی توبہ‘‘ کا پیش خیمہ بن جائے۔ اور اُس کے نتیجے میں ایک جانب وہ رحمتِ خداوندی جو ہماری اللہ کے ساتھ ساٹھ سالہ قومی و اجتماعی بدعہدی کے باعث اس وقت ہم سے روٹھی ہوئی ہے دوبارہ ہمارے شاملِ حال ہو جائے اور دوسری جانب مولانا مودودی مرحوم کی روح کو بھی عالمِ برزخ میں خوشی حاصل ہو۔ وما ذٰلك على الله بعزيز!

اس وقت وطنِ عزیز پاکستان گوناگوں نوعیت کی داخلی اور خارجی یلغاروں کی زد میں ہے اور اس کا عین وجود خطرے میں پڑا ہوا نظر آ رہا ہے ــــــ اس حالت میں ایک حقیقی انقلابی سعی کی ضرورت ہے جس کا آغاز بھی جماعت اسلامی کی ساٹھ سالہ پالیسی میں ’’انقلاب‘‘ سے ہو سکتا ہے ــــــ تاہم اگر جماعت اسی موجودہ روش کو جاری رکھنے کا فیصلہ کرتی ہے تب بھی ظاہر ہے کہ ایک منظم جماعت اور اس کے ملک گیر تنظیمی ڈھانچے ــــــ اور خواہ کتنا ہی مختصر سہی مگر بہرحال ایک ووٹ بینک کے سہارے انتخابی سیاست کے میدان میں اتحادوں اور seat adjustment کے ذریعے کسی نہ کسی درجہ میں اپنا وجود تو برقرار رکھ سکے گی ــــــ لیکن اقامتِ دین کی مطلوبہ منزل کی جانب پیش قدمی کا کوئی امکان نہیں ہے‘ بلکہ شدید اندیشہ ہے کہ جماعت کا وہ تحریکی اور تنظیمی اضمحلال جس کا برملا اعتراف یکے از نائب امراء جماعت اسلامی چوہدری رحمت الٰہی صاحب نے اپنے ایک حالیہ انٹرویو میں کیا ہے‘ جو جماعت ہی کے جریدے ’’جسارت‘‘ کی خصوصی اشاعت میں شائع ہوا ہے‘ وہ مزید بڑھتا چلا جائے اور جماعت اسلامی بھی تحریکوں اور جماعتوں کے قبرستان میں دفن ہو کر رہ جائے! اعاذنا الله من ذلك ! ــــــ آخر میں دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس نازک مرحلے پر جماعت کی درست رہنمائی فرمائے‘ آمین ثم آمین!!

علامہ اقبال اور سید سلیمان ندوی

عبدالرشید عراقی

علامہ اقبال کے بارے میں ڈاکٹر اسلم لکھتے ہیں:

''حکیم الامت علامہ محمد اقبال ایک عظیم شاعر تھے۔ ان کی ولولہ انگیز شاعری نے ہندوستان کے محوخواب مسلمانوں کو جھنجھوڑ کر خواب غفلت سے بیدار کر دیا۔ ان کا فکر انگیز کلام پاک و ہند کے مسلمانوں کا ہی نہیں، پوری ملت اسلامیہ کا درخشاں سرمایہ ہے۔ اُنہوں نے قرآن و حدیث اور تاریخ اسلام کے ساتھ علوم حاضرہ اور یورپی مزاج و معاشرہ کا بھی گہرا مطالعہ کیا تھا۔ ان کی نگاہ مذاہب عالم کے بطون تک اُتری ہوئی تھی۔ وہ اسلام کی عظمت و رفعت کے قائل تھے اور اول و آخر سچے مسلمان اور عاشق رسول تھے۔ اُن کا قلب مسلمانوں کے درد سے معمور تھا۔ وہ بہر صورت ہندی مسلمانوں کو انگریز اور ہندو دونوں کے آہنی تسلط سے آزاد دیکھنا چاہتے تھے۔ ان کی بصیرت نے محسوس کر لیا تھا کہ مسلمانوں کے لئے علیحدہ وطن کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ وہ اسلامیان ہند کو اقوام عالم کی صف میں سربلند و سرفراز دیکھنا چاہتے تھے۔ وہ عظیم فلسفی، اعلیٰ پائے کے مدبر اور صاحب بصیرت دانشور تھے۔ ان کی دانش اور تدبر نے اسلامیان ہند کی تاریک راہوں کو اجال دیا اور ان کے لئے ایک سمت، ایک منزل، ایک مقصود، ایک نصب العین کا تعین کیا۔ وہ اگرچہ دیگر سیاستدانوں کی طرح باقاعدہ سیاستدان نہ تھے، مگر بے پناہ سیاسی بصیرت کے مالک تھے۔ انہوں نے 1926ء پنجاب لیجسلیٹو کونسل کا باقاعدہ رکن منتخب ہو کر عملی سیاست کے خارزار میں قدم رکھا۔''

سید سلیمان ندوی کی شخصیت کے بارے میں ڈاکٹر فہیم صدیقی ندوی رقمطراز ہیں:

''علامہ سید سلیمان ندوی اپنے علمی تبحر اور فضل و کمال کے ساتھ بے حد قلمون، متنوع الصفات اور مختلف الکمالات شخصیت کے حامل تھے۔ وہ بیک وقت مؤرخ بھی تھے اور محقق بھی، متکلم بھی تھے اور فلسفی بھی، فقیہ بھی تھے اور محدث بھی، ادیب بھی تھے اور شاعر بھی، صوفی بھی تھے اور معلم بھی، نقاد بھی تھے نعت نویس بھی اور سب سے بڑھ کر وہ ایک عظیم سیرت نگار تھے۔''

علامہ اقبال اور سید سلیمان ندوی کے درمیان مراسلت کا سلسلہ 1914ء سے تھا۔ 1915ء میں جب سید صاحب نے اعظم گڑھ میں دارالمصنفین قائم کیا تو اس کے اساسی ارکان میں علامہ اقبال کو بھی شامل کیا۔

سید صاحب کی پہلی ظاہری ملاقات علامہ اقبال سے اپریل 1927ء میں ہوئی۔ جب سید صاحب انجمن حمایت اسلام لاہور کے سالانہ اجلاس میں تشریف لائے۔ سید صاحب اس پہلی ملاقات کے بارے میں لکھتے ہیں:

''یہ لکھنے میں میرا دل خوشی اور مسرت سے لبریز ہے کہ لاہور کے اہل قلم اور اہل علم طبقہ نے اپنی برادری کے اس کمترین ممبر کو خوش آمدید کہنے میں پوری فیاضی کا ثبوت دیا۔ مولوی ظفر علی خان نے تو اپنے گھر میں مہمان اُتارا..... ڈاکٹر اقبال سے یہ میری پہلی ظاہری ملاقات تھی اور مراسلت کی باطنی ملاقات 1914ء سے قائم ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے کرم کیا کہ ملنے میں پیش قدمی فرمائی۔ قیام گاہ پر آئے متعدد صحبتوں میں ساتھ رہے۔ پھر خود اپنے کاشانہ میں مدعو کیا جس کو وہ خود دارالفقراء کہتے ہیں اور میں دارالاقبال کہوں گا۔''

(معارف مئی 1927ء حیات سلیمان ص 327)

دوسری ظاہری ملاقات اپریل 1933ء میں ہوئی جب سید صاحب ادارہ معارف اسلامیہ لاہور کے پہلے سالانہ اجلاس میں شرکت کے لئے لاہور تشریف لائے۔ اس اجلاس کی صدارت علامہ اقبال نے فرمائی تھی۔ اس اجلاس میں سید صاحب نے ایک محققانہ مقالہ پڑھا تھا، جس کا عنوان تھا: لاہور کا ایک مہندس خاندان۔ جس نے تاج محل اور لال قلعہ بنایا۔ اس مقالہ میں سید صاحب نے بڑی تلاش و جستجو، تحقیق اور مستند شہادتوں سے مدلل کرتے ہوئے یہ بتایا تھا کہ تاج محل کا معمار درحقیقت استاد احمد معمار ہے جو ہندسہ، ہیت اور ریاضیات کا بڑا عالم تھا۔ (حیات سلیمان ص 399)

علامہ اقبال اور سید صاحب کی تیسری ظاہری ملاقات اکتوبر 1933ء میں ہوئی جب نادر شاہ (شاہ افغانستان) کی دعوت پر انہوں نے افغانستان کا علمی و تعلیمی سفر کیا۔ اس سفر میں سید صاحب، علامہ اقبال اور سر راس مسعود شامل تھے۔ اس سفر کی روداد سید صاحب نے کتابی صورت میں ''سیر افغانستان'' کے نام سے شائع کی۔

علامہ اقبال علامہ سید سلیمان ندوی کے علم و فضل اور علم اسلامیہ میں جامع الکمالات ہونے کے معترف تھے۔ علامہ اقبال اپنے ایک مکتوب محررہ 28 اپریل 1918ء میں لکھتے ہیں:

آج مولانا ابوالکلام کا خط آیا ہے۔ انہوں نے بھی میری اس ناچیز کوشش کو بہت پسند فرمایا ہے۔ مولانا شبلیؒ کے بعد آپ استاد الکل ہیں۔ اقبال آپ کی تنقید سے مستفید ہوگا۔'' (اقبالنامہ 80/1)

1924ء میں سید صاحب کی کتاب سیرت عائشہؓ شائع ہوئی تو انہوں نے اس کا ایک نسخہ علامہ اقبال کو بھیجا۔ کتاب کی رسید پر علامہ اقبال نے سید صاحب کو لکھا:

''سیرت عائشہؓ کے لئے سراپا سپاس ہوں۔ یہ ہدیۂ سلیمانی نہیں، سرمۂ سلیمانی ہے۔ اس کتاب کے پڑھنے سے میرے علم میں مفید اضافہ ہوگا۔ خدا تعالیٰ جزائے خیر دے۔'' (اقبال نامہ 113/1)

1933ء میں سید صاحب کی کتاب ''خیام'' شائع ہوئی۔ جب یہ کتاب علامہ اقبال کے پاس پہنچی تو آپ نے سید صاحب کو لکھا:

''عمر خیام پر آپ نے جو کچھ لکھ دیا ہے اس پر اب کوئی مشرقی یا مغربی عالم اضافہ نہ کر سکے گا۔ الحمدللہ کہ اس بحث کا خاتمہ آپ کی تصنیف سے ہوا۔'' (اقبالنامہ 178/1)

21 اپریل 1938ء کو علامہ اقبال نے لاہور میں رحلت فرمائی، تو علامہ سید سلیمان ندوی نے معارف مئی 1938ء میں ''ماتم اقبال'' کے عنوان سے ایک تعزیتی مضمون لکھا: جس کا ایک اقتباس درج ذیل ہے:

''ڈاکٹر اقبال ہندوستان کی آبرو، مشرق کی عزت اور اسلام کا فخر تھا۔ آج دنیا اس ساری عزتوں سے محروم ہو گئی۔ ایسا عارف فلسفی اور عاشق رسول شاعر، فلسفہ اسلام کا ترجمان، اور کاروان ملت کا حدی خواں صدیوں کے بعد پیدا ہوا تھا، اور شاید صدیوں کے بعد پیدا ہو۔ اس کے ذہن کا ہر ترانہ بانگ درا، اس کی جاں حزیں کی ہر آواز زبور عجم، اس کے دل کی ہر فریاد پیام مشرق، اس کے شعر کی ہر پرواز بال جبریل تھی۔ اس کی فانی عمر ختم ہو گئی، لیکن اس کی زندگی کا ہر کارنامہ جاوید نامہ بن کر ان شاء اللہ باقی رہے گا۔

مرحوم کی زندگی کا ہر لمحہ ملت کی زندگی کے لئے ایک نیا پیام لایا تھا۔ وہ توحید خالص کا پرستار، دین کامل کا علمبردار، اور تجدید ملت کا طلبگار تھا۔ اس کے رونگٹے رونگٹے میں رسول انام علیہ السلام کا عشق پیوست تھا۔ اس کی آنکھیں جسم اسلام کے ہر زخم پر اشک بار رہتی تھیں۔ اس نے مستقبل اسلام کا ایک خواب دیکھا تھا۔ اسی خواب کی تعبیر میں اس کی ساری عمر ختم ہو گئی۔

اقبال ہندوستان کا فخر، اقبال اسلامی دنیا کا ہیرو، اقبال فضل و کمال کا پیکر، اقبال حکمت و معرفت کا دانا اقبال کاروان ملت کا رہنما، رخصت رخصت، الوداع، الوداع۔ سلام اللہ علیک ورحمتہ'' (یادرفتگان ص 181)

قابلِ نفرت فوج نہیں، حکمران ہیں!

محمد سمیع

جب اپنے وطن کی تاریخ پر نگاہ پڑتی ہے تو صاف دکھائی دیتا ہے کہ ہمارے حکمرانوں نے ملک کے مختلف اداروں کو اپنے مفادات کے لئے استعمال کر کے ان کو عوام کی نظروں سے گرا دیا ہے۔ پولیس کے محکمے کو ہر حکومت نے خوب خوب استعمال کیا اور جب حکومتوں نے اس ادارے کے ناجائز استعمال کو اپنے لئے روا رکھا تو اس کا فطری ردِعمل یہ ہونا تھا اور ہوا کہ پولیس کا محکمہ اپنی حیثیت کا ناجائز فائدہ اٹھانے لگا اور اپنے اس عمل میں یہ محکمہ شیر بن گیا۔ اسے پتہ تھا کہ حکومتیں اس کے اس عمل سے چشم پوشی اختیار کرنے پر مجبور ہوں گی کیونکہ اگر انہوں نے اس سے باز پرس کا رویہ اختیار کیا تو آئندہ انہیں اس کی توقع کیسے ہو سکتی ہے کہ وہ اس محکمے کو اپنے مذموم عزائم کے لئے استعمال کر سکیں گی۔ لہٰذا جو پولیس والوں کے ہتھے چڑھ گیا، اس کی شامت آ گئی۔ ملزم کے ساتھ مجرم جیسا سلوک کرنا، تھرڈ ڈگری کا استعمال اور جو اس پر تشدد ردِعمل سے بچنا چاہے، اس کی جیبیں خالی کرنا، پولیس کا وطیرہ بن گیا۔ عوام میں یہ ضرب المثل مشہور ہے کہ پولیس والے اپنے باپ کے بھی نہیں ہوتے یعنی موقع ملے تو اس کے ساتھ وہی سلوک کریں جو وہ عام لوگوں کے ساتھ کرتے ہیں۔ پولیس کا خوف لوگوں پر مسلط ہو گیا اور جب کسی کا خوف اس کے مظالم کی وجہ سے کسی پر مسلط ہو جائے اور وہ اس سے ظلم کا بدلہ لینے پر قادر نہ ہو تو دل میں اس کے خلاف نفرت پیدا ہونا ایک فطری امر ہے۔ لہٰذا آپ کے مشاہدے میں یہ بات آئی ہو گی کہ اگر کوئی پولیس والا قانون کی خلاف ورزی پر بھی کسی ویگن والے کو روک لے تو دیکھنے والا یہ سمجھتا ہے کہ اسے ایک ''اسامی'' میسر آ گئی۔

فوج ملک کا ایک باوقار ادارہ ہے۔ لیکن ہمارے ظالم حکمران اسے بھی چرکہ لگانے سے باز نہ آئے۔ ملکی مفاد کے نام پر اپنے اقتدار کو بچانے کے لئے آج اس ادارے کو جس طرح استعمال کیا جا رہا ہے اس کی مثال ماضی کے کسی بھی دور حکومت میں نہیں ملتی۔ اپنے اقتدار کو استحکام کی خاطر اور امریکہ کو خوش کرنے کے لئے اسے قبائلی علاقوں میں استعمال کیا جا رہا ہے اور بے چارے فوجی ڈسپلن کے پابند اپنی حکومت کے حکم پر اپنے ہی لوگوں کے خلاف نبرد آزما ہیں حالانکہ اس کے نتیجے میں فوج کو بھاری جانی قربانی بھی پیش کرنی پڑی ہے۔ لیکن فوج کو اپنے ملک سے وفاداری کے باوجود آج جس طرح عوامی نفرت کا سامنا ہے، پہلے کبھی ایسی صورتحال پیدا نہیں ہوئی۔ آج ہمارا وطن ہر چہار اطراف سے خطرات میں گھرا ہوا ہے اور یہ صورتحال جن کی وجہ سے پیدا ہوئی، المیہ یہ ہے کہ انہی کی جانب سے ہمارے ملک پر حملے کی دھمکیاں دی جا رہی ہیں۔ یہ سوچ سوہان روح سے کم نہیں کہ جس فوج کی عوام میں عزت و توقیر باقی نہ رہے، جو اپنے چند جنرلوں کے مذموم عزائم کی تکمیل کی بھینٹ چڑھنے کے نتیجے میں عوامی نفرت کا شکار ہو جائے، وہ کس طرح اپنے وطن کا دفاع کر سکتی ہے، کیونکہ فوج عوامی حمایت کے بغیر اپنے دشمنوں سے لڑنے میں کبھی کامیاب نہیں ہو سکتی۔

اس کی دو مثالیں تو وطنِ عزیز کی تاریخ میں موجود ہیں۔ 1965ء میں جب بھارت نے پاک سرزمین پر شب خون مارا تو ہمارے جانباز فوجی دشمن کے مقابلے میں ڈٹ گئے کیونکہ عوام ان کی پشت پر تھے۔ چانگام سے لے کر پشاور تک ہم پاکستانیوں نے جس تاریخی اتحاد کا مظاہرہ کیا اس کی مثال ملک کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ لوگ سرحدوں پر جا جا کر فوجیوں کا حوصلہ بڑھاتے، کھانے کی دیگیں ساتھ لے کر جاتے۔ فوج سے ایک والہانہ محبت تھی جس کا مظاہرہ 1965ء میں سامنے آیا۔ اہل قلم نے قومی ترانے تحریر کئے۔

اپنی جان نذر کروں، اپنی وفا پیش کروں
قوم کے مردِ مجاہد تجھے کیا پیش کروں

یہ قومی نغمہ گویا فوج سے عوام کی والہانہ محبت کا مظہر تھا۔ ایسے ہی پتہ نہیں کتنے قومی نغمے فضا میں گونجتے رہے اور فوج کا حوصلہ بڑھاتے رہے اور بالآخر دشمن کو فوج نے دم دبا کر بھاگنے پر مجبور کر دیا، لیکن یہ وہی فوج تھی جو جنرل یحییٰ خان کے حکم پر مشرقی پاکستان میں بنگالیوں کے خلاف نو ماہ تک نبرد آزما رہی۔ اسے دریاؤں اور ندی نالوں کی اس سرزمین میں ہر قدم پر اُسے اپنے ہی قوم کے لوگوں کا سامنا تھا۔ فوج آپریشن کرتی رہی اور اس آرمی ایکشن کے نتیجے میں وہی بنگالی عوام جنہوں نے پاکستان کے قیام میں اہم ترین کردار ادا کیا تھا، جنہوں نے 1965ء میں فوج کا بھرپور ساتھ دیا تھا، فوج کی پشت پر چھرا گھونپنے میں مصروف تھے۔ ایسا کیوں ہوا؟ اس کا اندازہ اس واقعہ سے لگایا جا سکتا ہے۔ ڈھاکہ میں مسلم کمرشل بنک میں ایک بنگالی سے گفتگو ہو رہی تھی۔ جب اس سے یہ سوال کیا گیا کہ آج تم لوگ فوج کے اس قدر شدید دشمن کیوں ہو رہے ہو تو اس کا جواب تھا۔ ''صاحب میں نرسنگدی میں ایک گاؤں کا رہنے والا ہوں۔ رات کو ہمارے گاؤں پر مکتی باہنی والے فائرنگ کرتے ہوئے آتے ہیں اور غلہ وغیرہ لوٹ کر لے جاتے ہیں۔ اس کے بعد فوج آتی ہے۔ وہ پورے گاؤں کا محاصرہ کرتی ہے۔ ہم سے پوچھا جاتا ہے کہ مکتی باہنی کہاں گئے۔ ہم کیا جواب دے سکتے تھے جبکہ ہمیں خود نہیں معلوم کہ وہ کہاں سے آئے اور کہاں چلے گئے۔ اس پر فوج بھی ہم پر ہر قسم کا ظلم و ستم کرتی ہے۔ ہم سوچتے ہیں کہ جب مکتی باہنی اور ہماری فوج دونوں ہم پر ظلم کر رہے ہیں تو ہم فوج کا ساتھ کیوں دیں، اپنے لوگوں کا ساتھ کیوں نہ دیں۔ آج ہر بنگالی انہیں خطوط پر سوچ رہا ہے۔'' اب تو یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ یحییٰ خان نے یہ سارا چکر محض اپنی صدارت قائم رکھنے کے لئے چلایا تھا۔ اگر شیخ مجیب جسے الیکشن کے نتیجے میں ملک پر برسر اقتدار آنے کا حق تھا، یحییٰ خان کو صدر کے طور پر قبول کر لیتا تو نہ وہ آرمی ایکشن ہوتا اور نہ ہمارا دایاں بازو ہم سے الگ ہوتا، آرمی ایکشن متحدہ پاکستان کے تابوت میں آخری کیل ثابت ہوا۔

تاریخ پھر اپنے آپ کو دہرا رہی ہے۔ آج بھی ایک فوجی جنرل اپنی صدارت کو دوام بخشنے کے لئے ملک کی سالمیت کے درپے ہے۔ وزیرستان سمیت پورا قبائلی علاقہ، سوات اور پورا بلوچستان سلگ رہا ہے۔ صدارت باقی وردی کی کھال کوئی نہ اتارے خواہ یہ آگ پورے ارضِ وطن پر پھیل جائے۔ اس کی سزا فوجی بھگت رہے ہیں۔ وہ آج اسی طرح نفرت کا نشانہ بنے ہوئے ہیں جس طرح آج سے 36 سال قبل سقوط ڈھاکہ سے پہلے بنے ہوئے تھے۔ کیا اس پوری قوم میں کوئی ایک رجلِ رشید نہیں جو ہمارے حکمرانوں کو اس طرح کے اقدامات سے باز رہنے کے لئے قائل کر سکے۔ وکلاء نے اپنی تحریک کا پہلا مرحلہ تو کامیابی سے طے کر لیا۔ اللہ کرے وہ اگلے مرحلے میں بھی کامیاب ہوں اور قوم کو جنرلوں کی حکمرانی سے نجات ملے۔ لیکن پھر بھی مسئلہ مکمل طور پر حل نہیں ہو گا، کیونکہ عدل کی ضمانت کے بغیر مختلف قومیتیں نہ ایک قوم بن سکتی ہیں نہ اکٹھی رہ سکتی ہیں۔ اور عدل کی ضمانت صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کے وضع کردہ نظامِ عدل اجتماعی میں ہے۔ پاک سرزمین ہر قسم کے تعصبات اور منفی عوامل سے پاک یہ نظام نافذ ہو تو قوم متحد بھی ہو گی اور وطنِ عزیز کو استحکام بھی نصیب ہو گا۔ یہی قیامِ پاکستان کا مقصد تھا۔ یہی اس مملکتِ خداداد کی اصل منزل ہے۔ ان شاء اللہ آج نہیں تو کل اسے یہ منزل مل کر رہے گی۔

جنگی مجرم

حامد میر

24 اکتوبر 2007 کو امریکی دارالحکومت واشنگٹن میں ایک حیران کن واقعہ پیش آیا۔ امریکی وزیرخارجہ کنڈولیزا رائس کانگریس کی فارن افیئرز کمیٹی کے سامنے بیان دینے آئیں۔ کمیٹی کے چیئرمین ٹام لینٹاس نے ان کا خیر مقدم کیا اور انہیں لے کر جیسے ہی کمیٹی کے اجلاس میں پہنچے تو وہاں امریکہ کی امن تحریک کے کارکنوں نے میڈم رائس کے خلاف نعرے بازی شروع کر دی۔ واشنگٹن کی پولیس نے ان مظاہرین کو پکڑ پکڑ کر اس ہال سے باہر نکالنا شروع کر دیا جہاں فارن افیئرز کمیٹی کا اجلاس ہونے والا تھا تاہم ایک سفید فام خاتون کرسیاں پھلانگ کر کنڈولیزا رائس کے بالکل قریب پہنچ گئی۔ اس خاتون نے اپنے دونوں ہاتھوں کو سرخ رنگ میں ڈبو رکھا تھا اور ایسا لگتا تھا کہ اس کے ہاتھ خون آلود ہیں۔ اس خاتون نے اپنے رنگین ہاتھوں کو میڈم رائس کے سامنے لہرایا اور زور زور سے ''جنگی مجرم'' کے نعرے لگائے۔ ''جنگی مجرم'' کے نعرے سن کر امریکی وزیرخارجہ چند لمحوں کے لئے ٹھٹھک گئیں، کیونکہ یہ نعرے کوئی مسلمان نہیں بلکہ ایک سفید فام مسیحی خاتون بلند کر رہی تھی جسے القاعدہ کا حامی قرار دینا ممکن نہ تھا۔ موقع پر موجود فوٹو گرافروں نے اس سفید فام خاتون کی بہادری اور میڈم رائس کی پریشانی کے لمحات کو کیمرے کی آنکھ سے محفوظ کر کے پوری دنیا میں پھیلا دیا۔

امریکی وزیرخارجہ کو ''جنگی مجرم'' قرار دینے والی سفید فام عورت کو چند ہی لمحوں میں پولیس نے اٹھا کر ہال سے باہر پھینک دیا لیکن یہ عورت اپنا کام کر چکی تھی۔ اگلے روز دنیا بھر کے اخبارات میں اس کی تصویر شائع ہوئی اور یہ ثابت ہو گیا کہ تمام امریکی صدر جارج ڈبلیو بش کے جنگی ایجنڈے کی حمایت نہیں کرتے۔ میڈم رائس کو ''جنگی مجرم'' قرار دینے والی سفید فام عورت امریکہ کی اس امن تحریک کا حصہ ہے جو پچھلے چھ سال سے افغانستان اور عراق میں امریکی فوج کی جارحیت کو عالمی امن کے لئے خطرہ قرار دے رہی ہے۔ امریکی میڈیا اس امن تحریک کو زیادہ اہمیت نہیں دیتا لیکن اس تحریک کے بہادر کارکن وقفے وقفے سے نت نئے طریقوں کے ذریعہ دنیا کو یہ پیغام دینے میں کامیاب رہتے ہیں کہ صدر جارج ڈبلیو بش پوری امریکی قوم کے ترجمان نہیں ہیں اور پوری امریکی قوم بش کے جنگی جرائم کی ذمہ دار نہیں ہے۔

پچھلے سال مارچ میں کنڈولیزا رائس آسٹریلیا کے شہر سڈنی میں ایک تقریب سے خطاب کرنے پہنچیں تو وہاں بھی اینٹی وار موومنٹ کے چند درجن حامیوں نے ان کے خلاف مظاہرہ کیا۔ پچھلے چند سال میں ایسے کئی واقعات پیش آئے جب یورپ کے مختلف ممالک میں جارج ڈبلیو بش، کنڈولیزا رائس اور برطانیہ کے سابق وزیراعظم ٹونی بلیئر کے خلاف مظاہرے ہوئے، جن میں مطالبہ کیا گیا کہ بش اور بلیئر کے خلاف عالمی عدالت برائے جنگی جرائم میں مقدمہ چلایا جائے۔ مسلم ممالک کے میڈیا میں امریکہ اور یورپ کی اس امن تحریک کو نظر انداز کرنے کی وجہ یہ ہے کہ ان ممالک کے میڈیا کی اکثر خبروں کا انحصار مغربی ذرائع ابلاغ پر ہوتا ہے۔ جو مخصوص نقطۂ نظر کے تحت خبریں شائع کرتے یا انہیں غائب کر دیتے ہیں۔ لیکن مغربی ذرائع ابلاغ 24 اکتوبر کو میڈم رائس کے سامنے سرخ رنگ میں ڈوبے ہوئے ہاتھ لہرانے والی عورت کی تصویروں کو غائب نہیں کر سکے۔ اِس عورت کی تصویروں کی اشاعت پر مجھے سوات اور بنوں سے کئی فون آئے۔ سوات سے فون کرنے والے نوجوان نے سوال کیا کہ اگر امریکہ میں بش کی پالیسیوں کے مخالف موجود ہیں تو پھر ہم امریکہ مردہ باد کی بجائے امریکی حکومت مردہ باد کے نعرے کیوں نہیں لگاتے؟ میں نے اس نوجوان سے کہا کہ آپ کے سوال میں جواب بھی موجود ہے۔ بنوں سے فون کرنے والے نوجوان کا تعلق شمالی وزیرستان سے تھا۔ کہنے لگا کہ امریکی وزیرخارجہ کے سامنے مظاہرہ کرنے والی عورت مسلمان تھی یا مسیحی؟ میں نے بتایا کہ وہ مسلمان نہیں تھی ورنہ اس کی گرفتاری کے بعد یہ خبر ضرور جاری ہوتی کہ کنڈولیزا رائس پر حملہ کرنے والی دہشت گرد مسلمان عورت کو پکڑ لیا گیا۔ اور ویسے بھی امریکہ کی امن تحریک میں اکثریت مسیحیوں کی ہے۔ یہ سننے کے بعد اس نوجوان نے دوسرا سوال یہ کیا کہ اگر امریکہ میں بش کو ''جنگی مجرم'' قرار دیا جا سکتا ہے اور امریکی وزیرخارجہ کے سامنے کھڑے ہو کر حکومت کے خلاف نعرے لگائے جا سکتے ہیں تو پھر پاکستان میں امریکہ کے خلاف نعرے بازی کیوں نہیں ہو سکتی؟ یہ نوجوان خود ہی بولتا گیا اور کہنے لگا کہ اگر خودکش حملوں میں بے گناہوں کو مارنے کی بجائے ہم بڑے شہروں میں دس پندرہ ہزار لوگ کو اکٹھا کر کے بش کے خلاف مظاہرے کریں تو وہ زیادہ مؤثر ثابت ہو سکتے ہیں لیکن افسوس کہ سیاسی جماعتوں کے قائدین یہ کام نہیں کرتے۔ یہ قائدین میڈیا میں امریکہ پر تنقید کرتے ہیں اور اندر خانے امریکی سفارتکاروں سے خفیہ ملاقاتیں کرتے ہیں۔ آج ہمیں ایسے قائدین کی ضرورت ہے جو اقتدار کے لالچ میں نہ تو امریکہ کے ہاتھوں میں کھلونا بننے کے لئے تیار ہوں اور نہ ہی سیاسی مفادات کے لئے جگہ جگہ امریکہ کو نیست و نابود کرنے کے دعوے کریں۔ ہمیں ضرورت ہے ایسی قیادت کی جو پاکستان کے قومی مفادات کے سامنے رکھتے ہوئے امریکہ کی غلط حکومتی پالیسیوں پر بلاخوف و خطر تنقید کرے اور احتجاج کے انہی سیاسی طریقوں کو فروغ دے جو امریکہ میں بھی موجود ہیں۔ آج پاکستان میں امریکہ کے خلاف بڑھتی ہوئی نفرت اور خودکش حملوں کی اصل وجہ حکومت کی طرف سے طاقت کا بے جا استعمال ہے۔ حکومت نے دفعہ 144 کے ذریعہ سیاسی احتجاج کو دبا کر خود شدت پسندی کا مظاہرہ کیا ہے۔

رہی سہی کسر اس ملک کے مٹھی بھر لبرل فاشسٹ پوری کر رہے ہیں جو فوج کو شمالی وزیرستان، جنوبی وزیرستان اور سوات میں طاقت کے استعمال کی ترغیب دے کر جلتی پر تیل چھڑکتے ہیں۔ یہ لبرل فاشسٹ حکومت سے کہتے ہیں کہ بھارت سے تو مذاکرات کرو لیکن اپنوں پر بم برساؤ۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ قبائلی علاقوں اور سوات کے اسلامی عسکریت پسندوں کے ساتھ ساتھ بلوچستان کے قوم پرستوں کے ساتھ بھی مذاکرات کا راستہ اختیار کیا جائے۔ لبرل فاشسٹ فوج کو اپنے ہی نوجوانوں سے لڑانے کی پوری کوشش کر رہے ہیں۔ چند دن قبل ایک انگریزی اخبار نے لال مسجد کے نائب خطیب عامر صدیقی سے یہ بیان منسوب کیا کہ سوات میں فوج پر خودکش حملے درست ہیں۔ اگلے روز ایک اور انگریزی اخبار نے عامر صدیقی اور سوات والوں کے خلاف بھرپور کارروائی کا مطالبہ کر دیا۔ اس سلسلے میں جب سیکریٹری داخلہ سید کمال شاہ نے انکوائری کی تو پتہ چلا کہ عامر صدیقی نے ایسی کوئی بات نہیں کی تھی اور یوں انہوں نے عامر صدیقی کے خلاف جنم لینے والے ایک بڑے طوفان کا راستہ روک لیا۔

غور کریں تو ہم دانستہ یا نادانستہ طور پر اپنے دشمنوں کے ہاتھ میں خود ہی کھیلنے کے لئے تیار ہیں۔ دشمنوں نے بڑے خوبصورت طریقے سے آج پاکستان میں وہ حالات پیدا کر دیے ہیں جو کچھ عرصہ پہلے تک مقبوضہ کشمیر میں تھے۔ آج مقبوضہ کشمیر میں بھارتی فوج کے لئے مشکلات کم ہو رہی ہیں لیکن پاکستان میں ہماری فوج کے لئے (باقی صفحہ 4 پر)

حلقہ وسطی پنجاب میں دورۂ ترجمۃ القرآن کا پروگرام

رمضان المبارک کا مقدس اور مبارک مہینہ امت مسلمہ کے لئے رب کریم کا فضل عظیم اور انمول تحفہ ہے۔ روزے کے روحانی فوائد سے خاطر خواہ استفادہ کے لئے 23 سال قبل 1984ء میں بانی تنظیم اسلامی محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب حفظہ اللہ نے ماہ رمضان میں نماز تراویح کے ساتھ دورۂ ترجمۃ القرآن کے پروگرام کا آغاز کیا۔ اس کا طریقہ کار یہ ہے کہ ہر چار رکعات میں پڑھے جانے والے قرآن حکیم کا ترجمہ اور تشریح تراویح سے پہلے حاضرین کے روبرو پیش کی جاتی ہے۔ جب مقتدی قرآن حکیم کے اس حصے کو نماز تراویح میں سنتے ہیں تو آیات کریمہ کا مفہوم ان کے ذہن میں تازہ ہوتا ہے اور حضوری کی کیفیت حاصل ہوتی ہے۔

1۔ مذکورہ بالا نظم اور طرز کو مدنظر رکھتے ہوئے جھنگ (حلقہ وسطی پنجاب) میں عرصہ آٹھ سال سے دورۂ ترجمۃ القرآن کا پروگرام جاری ہے۔ اس سال بھی رمضان المبارک میں جامع القرآن قرآن اکیڈمی جھنگ میں یہ پروگرام 13 ستمبر 2007ء بعد از نماز عشاء شروع ہوا۔ مسجد سے متصل خواتین ہال میں خواتین کے لئے نماز تراویح کا انتظام کیا گیا تھا۔ نماز تراویح میں قرآن حکیم سنانے کی سعادت مفتی عطاء الرحمٰن نے حاصل کی۔ جبکہ بعد ازاں ترجمہ اور تشریح کی سعادت امیر حلقہ وسطی پنجاب جناب انجینئر مختار فاروقی کے حصے میں آئی۔ آپ نے یہ ذمہ داری بڑے احسن طریقہ سے نبھائی۔ دوران پروگرام شرکاء کی چائے اور بسکٹ سے تواضع کی جاتی رہی۔ آخری عشرہ میں امیر حلقہ نے چار احباب کے ہمراہ اعتکاف کی سعادت حاصل کی۔ پروگرام میں شرکاء کی روزانہ اوسط حاضری 35 رہی۔ 26 رمضان المبارک کو دورۂ ترجمۃ القرآن کی اختتامی نشست ہوئی جس میں جشن تکمیل قرآن کی تقریب ہوئی۔ امیر حلقہ نے اپنی تقریر میں حاضرین کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ ایسے پروگرام شہر میں ہر جگہ پر ہونے چاہئیں۔ اس تقریب میں تقریباً 250 احباب شریک ہوئے۔ اجتماعی دعا کے بعد حاضرین میں شیرینی تقسیم کی گئی اور مشروب سے تواضع کی گئی، جس کا انتظام انجمن خدام القرآن جھنگ نے کر رکھا تھا۔

2۔ حلقہ وسطی پنجاب کے ضلع ٹوبہ ٹیک سنگھ میں مقامی امیر تنظیم پروفیسر خلیل الرحمٰن نے جامع مسجد قاسمیہ فیض کالونی میں تراویح کے بعد خلاصۂ قرآن کریم بیان کرنے کی ذمہ داری نبھائی۔ اس پروگرام کی اختتامی نشست 29 رمضان المبارک کو ہوئی جس میں پروفیسر صاحب کا اختتامی خطاب اور اجتماعی دعا ہوئی۔ حاضرین کی تواضع شیرینی اور چائے سے کی گئی۔ پورے پروگرام میں اوسط حاضری تقریباً 30 رہی اور اختتامی نشست میں حاضری تقریباً 100 کے لگ بھگ تھی۔ ٹوبہ ٹیک سنگھ میں دوسرا پروگرام جامع مسجد عمر بن الخطاب میں ہوا، جس میں نماز تراویح کے بعد خلاصۂ قرآن حکیم بیان کرنے کی ذمہ داری نقیب اسرہ زبیر بن عوام حافظ اصغر علی نے نبھائی۔ یہاں بھی شرکاء کی اوسط حاضری 30 رہی۔ ٹوبہ ٹیک سنگھ میں تیسرا پروگرام الہدیٰ لائبریری میں ہوا جس میں نماز ظہر کے بعد بذریعہ ویڈیو بانی تنظیم اسلامی محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب حفظہ اللہ کا دورۂ ترجمہ قرآن سنایا گیا۔ یہاں پر حاضری 100 کے قریب رہی۔

3۔ حلقہ وسطی پنجاب کے ضلع لیہ میں تراویح کے بعد خلاصۂ قرآن مجید بیان کرنے کی ذمہ داری نقیب اسرہ الہدیٰ لائبریری لیہ چودھری صادق علی نے نبھائی۔ آپ نے جامع مسجد ہاؤسنگ کالونی میں یہ پروگرام کیا۔ اس میں اوسط حاضری 25 رہی۔ چودھری صادق نے بعد از نماز فجر اس مسجد میں درس قرآن کی ذمہ داری بھی نبھائی۔ یہ پروگرام بھی اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے بہت کامیاب رہا۔ اللہ تعالیٰ سے دعا گو ہوں کہ ان پروگراموں کے منتظمین کو جزائے خیر عطا فرمائے۔ (آمین)

(مرتب: رانا صبغت اللہ)

بہاولنگر..... دورۂ ترجمہ قرآن کے شرکاء کے تاثرات

مسجد جامع القرآن والسنت بہاولنگر میں نماز تراویح کے ساتھ دورۂ ترجمہ قرآن کا اہتمام کیا گیا۔ بہاولنگر میں نماز تراویح کے ساتھ مکمل دورہ ترجمہ کا یہ پہلا موقع تھا۔ خواتین کے لیے مسجد کے ساتھ علیحدہ ہال میں انتظام تھا۔ شرکاء باقاعدگی سے اس پروگرام میں شرکت کرتے رہے۔ یہ پروگرام رات ساڑھے بارہ بجے تک جاری رہتا۔ تراویح کے اختتام پر بھی مردوں کی اوسط حاضری 25 ہوتی تھی۔ ترجمۂ قرآن کی ذمہ داری امیر حلقہ محمد منیر احمد نے نبھائی۔ پروگرام کے آخر میں ترجمہ قرآن کے پروگرام کے بارے میں شرکاء کے تاثرات معلوم کیے گئے جو درج ذیل ہیں۔

1۔ ارشد اقبال خٹک، میٹرک (ذاتی کاروبار)

میں نے 45 برس کی عمر میں پہلی بار دورۂ ترجمہ قرآن کی سعادت حاصل کی۔ ترجمہ قرآن سے مجھ پر واضح ہوا کہ قرآن تو دراصل اللہ تعالیٰ کا انسان سے خطاب ہے۔ اس سے قبل یہ حقیقت نگاہوں سے اوجھل تھی۔

2۔ سخی محمد، (ایم بی بی ایس) ڈاکٹر

الحمدللہ، میں نے مکمل دورۂ ترجمہ قرآن میں شرکت کی ہے۔ میرا خیال ہے کہ مدرس نے عام آدمی کے فہم کے مطابق آسان الفاظ میں قرآن حکیم کا ترجمہ پیش کیا، جس کے ساتھ ضروری تشریح بھی کی جاتی رہی۔

3۔ محمد کاشف ندیم، بی ایس سی (طالبعلم)

تنظیم اسلامی کے زیر اہتمام دورۂ ترجمہ قرآن کی یہ کاوش نہایت قابل قدر ہے۔ مجھے یوں محسوس ہوا کہ ہمیں مادہ پرستی کے اندھیروں سے نکال کر قرآن کی روشنی کی طرف لانے کی ایک عظیم کوشش کی گئی ہے۔

4۔ طالب حسین، ایم اے (ملازمت)

یہ پروگرام بہت ایمان فروز تھا۔ زندگی میں پہلی مرتبہ اپنے فرائض سے آگاہی ہوئی۔ ہر مسلمان کو ایسے پروگرام میں شرکت کرنی چاہیے۔

5۔ محمد انعام الحق عزمی (طالب علم)

ایسا پروگرام باقاعدگی سے ہر سال ہونا چاہیے۔ اس سے ہر شخص کو فائدہ پہنچتا ہے۔ میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں رجوع الی القرآن کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)

6۔ محمد سلیم اختر ایم۔اے، ایم ایڈ (ملازمت)

تنظیم اسلامی کا یہ پروگرام بہت ہی کامیاب رہا۔ میرے اندر قرآن کو سمجھنے کے لئے ایک نئی تڑپ پیدا ہوئی۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ایک مسلمان کے لئے قرآن وسنت مسلمان کے لئے سب سے بڑا سرمایہ ہے۔ اگر وہ ان سے لو لگالے، تو کبھی گمراہ نہ ہوگا۔

7۔ شبیر احمد بلوچ انڈر میٹرک (خراد ورکس)

ترجمۂ قرآن کریم کا یہ پروگرام ذہن کے بند دریچوں کو کھولنے کا باعث بنا۔ اللہ تعالیٰ منتظمین کو اجر عظیم عطا فرمائے، اور انہیں مزید ہمت اور استقامت دے (آمین)

8۔ ثاقب وسیم خاکوانی بی اے (تجارت)

میں نے پہلی بار قرآن حکیم کا ترجمہ سنا۔ معلوم ہوا کہ اصل علم اور حقیقی روشنی قرآن حکیم ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر قرآنی تعلیمات اور قرآنی پیغام کو عام کیا جائے اور ہم بالفعل اللہ کی کتاب کو اپنی زندگیوں پر لاگو کریں تو کوئی وجہ نہیں کہ دنیا میں اپنا کھویا ہوا مقام حاصل نہ کر سکیں۔

9۔ محمود اسلم ایم اے (پروفیسر)

قرآن حکیم کا مکمل پیغام سامنے آیا۔ ذاتی احتساب کا موقع ملا۔ میں سمجھتا ہوں کہ کم از کم سال میں ایک دفعہ ایسا پروگرام ذاتی اصلاح کے لیے ضروری ہے۔ تذکیر و یاددہانی نہ ہو تو انسان بھٹک جاتا ہے۔

درج بالا شرکاء کے علاوہ حاجی رحمت اللہ، محمد اسحاق، ریاض احمد، عبدالرحمٰن، انوار الحق، عثمان منور اور محمد موسیٰ نے بھی اپنے تاثرات بیان کئے۔ (مرتب: ابرار اشرف)

گجرات کے لرزہ خیز مسلم کش فسادات

2002 میں بھارتی صوبہ گجرات میں ہونے والے ہندو مسلم فسادات میں دو ہزار سے زائد مسلمان شہید ہو گئے تھے۔ اس وقت بھی کئی مسلمان رہنماؤں اور غیر جانبدار ہندو رہنماؤں نے اس امر کا اظہار کیا تھا کہ ان فسادات میں نریندر مودی کی انتہا پسند ہندو حکومت ملوث ہے۔ اب بھارت کے مشہور تفتیشی رسالے "تہلکہ" کی خفیہ چھان بین نے اس تصور کو حقیقت کا روپ دے ڈالا ہے۔ اس خفیہ رپورٹ سے فسادات کی ایسی خوفناک تفصیلات سامنے آئی ہیں کہ انہیں پڑھتے ہوئے دل لرز اٹھتا ہے۔

تہلکہ میگزین کے صحافیوں نے ان ہندو انتہا پسند رہنماؤں کے انٹرویو لیے جو مسلم کش فسادات میں شریک تھے۔ ایک نے پوری تفصیل سے بتایا کہ احمد آباد کی ایک آزاد خیال مسلمان شاعرہ کو مار کر کس طرح ٹکڑے ٹکڑے کیا گیا۔ پھر اُسے دیگر درجنوں مسلمانوں کے ہمراہ جلا دیا گیا۔ ایک اور رہنما نے بتایا کہ ایک حاملہ کو مار کر اس کا پیٹ پھاڑا گیا اور پھر بچہ کتوں کے سامنے پھینک دیا گیا۔ انتہا پسند ہندوؤں کے ایک جتھے کے سردار نے بڑی روانی سے بتایا! "مودی صاحب ہی نے یہ سارا بندوبست کیا تھا، ورنہ کس کی مجال تھی کہ مسلمانوں کو قتل کرتا۔ اس سارے واقعے میں انہی کا ہاتھ تھا، اگر وہ پولیس کو کہتے کہ ہمارا بندوبست کرو، تو سپاہی ہماری خوب خبر لیتے۔ مگر مودی صاحب کے حکم پر پولیس پرے پرے رہی۔ انٹرویو دینے والوں میں وشوا ہندو پریشد کا ایک رہنما بابو بجرنگ بھی شامل ہے۔ اس نے بتایا "مودی بھائی نے ہماری بڑی مدد کی، انہوں نے کہہ دیا کہ تم لوگوں کے پاس تین دن ہیں، ان تین دنوں میں جتنے مسلمان مار سکتے ہو، مار دو۔ ہمیں مودی بھائی کی مدد حاصل نہ ہوتی تو ہم کچھ نہیں کر سکتے تھے۔" اُس کا کہنا ہے کہ "مودی صاحب مرد آدمی ہے۔ اگر وہ مجھ سے کہیں کہ کمر کے ساتھ بم باندھ کر آدمیوں میں کود جاؤ، تو میں حکم کی تعمیل میں ایک منٹ نہیں لگاؤں گا۔ میں ہندو مت کے لیے سب کچھ کرنے کو تیار ہوں۔" حیرت انگیز بات یہ ہے کہ مسلمانوں کے دشمن وزیر اعلیٰ نے تین بار جج تبدیل کیے تا کہ بابو بجرنگ کی ضمانت ہو سکے۔

صحافیوں نے جتنے بھی انٹرویو کیے ان کی خفیہ طور پر ریکارڈنگ بھی کر لی گئی تا کہ گواہ اپنے بیان سے منحرف نہ ہو سکیں۔ یہ ریکارڈنگ بھارت کے دو ٹی وی چینلوں میں دکھائی جا چکی ہے۔ جب دو ٹی وی چینلوں نے مسلم کش فسادات میں حصہ لینے والوں کے انکشاف انگیز انٹرویو دکھائے، تو خصوصاً گجرات کی ریاستی حکومت میں ہلچل مچ گئی جلد ہی کیبل آپریٹروں کو حکم دے دیا گیا کہ وہ درج بالا ٹی وی چینلوں کی نشریات روک دیں۔ یہ حکم گو ضلعی افسر نے جاری کیا مگر ظاہر ہے اس کے پیچھے صوبائی حکومت کا ہاتھ ہے۔ یاد رہے کہ نریندر مودی بھارت کی سب سے بڑی اپوزیشن پارٹی بھارتیہ جنتا پارٹی کا اہم لیڈر ہے۔ نشریات بند کرنے کی وجہ یہ بتائی گئی کہ اس طرح ہندوؤں اور مسلمانوں کے جذبات بھڑک سکتے ہیں۔ اس انکشافاتی رپورٹ کے بعد حقوق انسانی کی تنظیمیں بھارتی عدالتوں پر زور دے رہی ہیں کہ وہ مسلمانوں کے قتل عام میں ملوث ہندو رہنماؤں کو سخت سے سخت سزائیں دیں۔

یہ انکشاف دو اور اہم اسباق بھی سامنے لائے ہیں۔ پہلا سبق ان پاکستانیوں کے لیے ہے جو بھارت کے ساتھ تعلقات میں تمام حدود پھلانگ لینا چاہتے ہیں۔ انہیں یاد رکھنا چاہیے کہ بھارت میں انتہا پسند ہندوؤں کی کثیر تعداد آباد ہے جو دل و جان سے مسلمانوں کے سخت خلاف ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا بڑا احسان ہے کہ اُس نے ہمیں علیحدہ وطن عطا کیا۔

دوسرا اہم سبق عالمی ذرائع ابلاغ کی منافقت کو آشکارا کرتا ہے۔ یہ ذرائع ابلاغ مسلمانوں کو بحیثیت دہشت گرد اور وحشی ثابت کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے لیکن ہندو مسلم فسادات میں شقی القلب ہندو نہ مظالم انہیں بالکل نظر نہیں آتے۔ اس لیے غلط تو نہیں کہا جاتا کہ یہود و ہنود اور نصاریٰ نے عالم اسلام کے خلاف گٹھ جوڑ کر رکھا ہے۔

افغانستان میں نیٹو کی ہار؟

مشہور امریکی اخبار "دی واشنگٹن پوسٹ" نے خبر دی ہے کہ افغانستان کے سلسلے میں امریکا اور نیٹو ممالک کے مابین اختلافات جنم لے رہے ہیں۔ یہی نہیں نیٹو کے ممالک بھی ایک دوسرے پر کیچڑ اچھالنے لگے ہیں۔ پچھلے ہفتے امریکی وزیر دفاع رابرٹ گیٹس نے کھلے عام نیٹو کے رکن ممالک پر الزام لگایا کہ وہ افغان آپریشنز کے سلسلے میں مزید فوجی اور جنگی سامان مہیا نہیں کر رہے۔ انہوں نے دھمکی دی کہ اگر نیٹو ممالک نے اپنے وعدے پورے نہ کیے، تو امریکا کو سودہ سے اپنی فوج نکال لے گا۔ اسی طرح نیٹو ممالک کے وزرائے دفاع کی حالیہ میٹنگ میں ہالینڈ نے شکایت کی کہ افغانستان میں امریکی، برطانوی اور کینیڈین فوجیوں کے ساتھ ولندیزی فوجی ہی طالبان سے نبرد آزما ہیں۔ دوسری طرف جرمنی، اٹلی، اسپین اور دیگر نیٹو ممالک نے اپنی فوج کو افغانستان کے محفوظ علاقوں میں رکھا ہوا ہے۔ اس کے جواب میں جرمن وزیر دفاع نے کہا "جنوبی افغانستان میں نیٹو، امریکا کی جارحانہ پالیسی کے باعث بہتری کم تباہی زیادہ آ رہی ہے۔"

ان اختلافات سے ظاہر ہے کہ اگر یہ گہرے ہو گئے، تو افغانستان میں نیٹو اور امریکا جنگ ہار سکتے ہیں۔ یاد رہے کہ افغانستان میں 28 ہزار امریکی جبکہ 25 ہزار نیٹو کے فوجی طالبان سے جنگ لڑ رہے ہیں۔

غزہ پٹی کا استحصال شروع

پچھلے جون کے وسط میں حماس نے الفتح کی سیکیورٹی فوج کو غزہ کی پٹی سے نکال کر علاقے پر قبضہ کر لیا تھا۔ جواب میں اسرائیلی حکومت نے اس علاقے کو دشمن قرار دے ڈالا۔ اب اسرائیلی حکومت نے اعلان کیا ہے کہ وہ مرحلہ وار خود کو اس علاقے سے الگ کر لینا چاہتی ہے۔ فی الوقت غزہ کی پٹی کو درکار تمام ایندھن اسرائیل کے راستے وہاں جا رہا ہے۔ اس کے علاوہ علاقے میں بجلی کی دو تہائی مقدار بھی اسرائیلی بجلی گھر فراہم کر رہے ہیں، اس کے علاوہ سامان خورد و نوش اور دیگر ضروریات زندگی کے لدے 100 ٹرک روزانہ اسرائیل سے غزہ پٹی میں داخل ہوتے ہیں۔ اگر اسرائیلی حکومت نے اپنے منصوبے کو عملی جامہ پہنانا شروع کر دیا، تو غزہ کی پٹی میں ایندھن، بجلی اور سامان خورد و نوش کی شدید قلت پیدا ہو سکتی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس سختی کا بار پٹی میں آباد ہر فلسطینی کو برداشت کرنا پڑے گا۔

ایران پر پابندیاں امریکی مفاد میں نہیں

سعودی عرب کے ولی عہد شہزادہ سلطان بن عبدالعزیز نے کہا ہے کہ ایران پر پابندیاں امریکا کے مفاد میں نہیں ہیں۔ کسی بھی فریق کو مشتعل کرنا امریکا کے لئے مفید نہیں۔ انہوں نے کہا کہ سعودی عرب خطے میں امن اور استحکام کے قیام پر یقین رکھتا ہے۔ سعودی عرب بیرونی قوتوں کی میزبانی نہیں کرے گا اور نہ ہی دنیا کی کسی قوت کے لئے رن وے یا بیس کا کردار ادا کرے گا۔

اسرائیلی آرمی چیف کا اعتراف

اسرائیلی چیف آف آرمی سٹاف گابی اشکنازی نے فلسطینیوں کو انسانی ڈھال کے طور پر استعمال کرنے کا اعتراف کیا ہے۔ انہوں نے کہا کہ نابلس اور اس کے گرد و نواح میں اسرائیلی افواج اپنے دفاع اور مجاہدین کی گرفتاریوں کے دوران فلسطینی شہریوں کو بطور ڈھال استعمال کرتی رہیں۔ انہوں نے اعتراف کیا کہ اسرائیلی فوج سے ایسی غلطیاں سرزد ہوئی ہیں جن سے معصوم شہریوں کا جانی و مالی نقصان ہوا ہے۔

امریکی سفارت کاروں کا عراق میں کام کرنے سے انکار

عراقی حریت پسندوں کی دلیرانہ کارروائیوں کی وجہ سے امریکی سفارت کاروں نے عراق میں ذمہ داریاں سنبھالنے سے معذرت کر لی ہے۔ بغداد میں امریکی سفارت خانے میں 250 سے زائد اسامیاں خالی ہیں۔ کوئی درخواست دینے کو تیار نہیں۔

the demand that the country live up to its original ethos. After a long wait in vain of over sixty years. So is the Original Sin of the militants at Swat held at point-blank range by the armed patriots. The vision betrayed, the dream gone sour_ who then are the patriots and who the traitors? Answers, anyone?

The voices of resentment at the great betrayal find no representation, no comforting echo in the corridors of power. They are leaderless, alientated, ostracized, disowned and even demonized. They are curtly told they do not belong. Just as the president had explained to us that the girls at the Jamia Hafsa shouldn't get our sympathies as they didn't belong to Islamabad, but had come from the 'frontier.' (Is the 'frontier' to be acknowledges as a part of the state? Does it still belong then?)

I remember the cartoon I saw in a history book dating back to Mussolini's fascist Italy of the 1930s. It showed Mussolini with his hand held tight over the crater of a smouldering volcano, at the bottom of which could be read, "this is going to hurt you much more than it hurts me now."

Every time I see the newsflash with headlines of suicide attacks and killer bombs going off in the northern areas, I remember the volcano. The volcano spewing out and unleashing its hurt, fire, tears and blood. I feel sorry for the victims and the lives lost. And I feel sorry about our inability to learn the rules of thumb: when you do not let the other be, when you do not let him live his way in his own home but impose an alien agenda with blind brute-force, you forget that it is going to hurt you too. You forget the grind of God's mills.

I feel sorry also for those who discriminate dead bodies into definitive labels of the denigrating 'killed' and the respectful 'martyred'_ definitions coined abroad. I laugh at the folly of him who raises himself on the pedestal of the judge, issuing the moral verdict of who to ennoble with 'martyrdom' and who to demean and sneer at with 'killed'_ the pygmy looking ridiculous in his clumsy giant's robe, forgetting that death does not discriminate but levels all; Forgetting the Ultimate Judgement that laughs to scorn the cleverly manipulated Machiavellian definitions; Forgetting that the universal criterion lives on still, deep inside men's hearts_ cornered, muffled... yet resisting, surviving and unsettling.

The echoes of the bloodbath in Lal Masjid resound audibly in the Silence as our ears are deafened by the noise of bombs, gunfire and bullets like hail. What with all of the State's intelligent designs to wipe out the memories, to obliterate the past in the way Orwell had predicted, the national tragedy resonates. Quietly, yet hugely it hulks in the background. Like the ethereal fragrance emanating from the much-frequented grave in Rojhan Mazari_ gently, quietly, subtly suffusing into the soul, touching a deep-buried cord somewhere in the recesses of the heart. In our desperate attempts to make light of the crime committed, to demonize and caricaturize the Immortalized by churning out State-approved versions of the tale, we forget that History's Judgement is stringent and unrelenting. History refuses to paint up and whitewash. It refuses to leave the pages blank. And it is History's Verdict that will outlast us all.

خوشخبری !

نہایت کم قیمت پر CDs اور DVDs حاصل کرنے کا سنہری موقع

منتخب نصاب ویڈیو

مدرس: ڈاکٹر اسرار احمد (بانی تنظیم اسلامی)

- ایک کمپیوٹر DVD میں (Windows Media Player) Rs45/-
- 5 کمپیوٹر CDs میں (Windows Media Player) Rs90/-
- 3 کمپیوٹر CDs میں (Mobile Phone 3GP Format) Rs.54/-

(موبائل فون پر Download کے لئے لیکن یہ کمپیوٹر پر بھی Quick Time Player
یا Nokia Multimedia Player پر چلتی ہیں
جو www.nokia.com سے Download کیا جا سکتا ہے)

- 2 کمپیوٹر CDs میں (Windows Media Player) Rs.36/-

(Windows Media Player کے فارمیٹ پر
لیکن Small Screen اور Lwo Picture Quality کے ساتھ)

برائے رابطہ: ڈاکٹر محمد ابراهیم

235۔لاریکس کالونی گڑھی شاہو، لاہور 0300-4624146

Vol: 16 Regd. No. LRL -50 No. 40

Weekly Nida-e-Khilafat Lahore

View Point

MARYAM SAKEENAH

THE AMPLITUDE OF SILENCE

The painting-up in white of the indelibly Red Lal Masjid (Red Mosque) is a powerful symbol. An attempt to whitewash the redness of the act, to erase the disturbing memory of blood, gore and decapitated dead bodies; to placate, to impose an Oblivion. Just like the naming of the 'Operation Silence.' An imposition of silence, an imposition of amnesia. Per force.

The Silence is audible, the absence almost palpable. The vacuum eternally gaping. Not to be talked about: the Unmentionable. Come July 12, the disturbing images were taken off screens, restive hearts fed again with all the usual rounds of jazz and glitz. The message: All's well. The tragedy became the Unmentionable and the Forbidden as the media docilely complied with the orders. I only understand now that our heroic media men believe in freedom only conditionally. Images and memories vapourized like the many tiny corpses that were whisked away, vanishing into thin air. The right to know the truth and the right to mourn was withheld.

The silence becomes criminal. For, as Brecht said, 'it implies silence about so many horrors.' 'Operation Silence': I admire the honesty of the guy who came up with that name. But why the silence? My mother taught me it was bad manners to talk about gory details to people, to bring up a sombre topic or to talk death at the dining table. We are being made to revise our lessons at table manners. A reality too shocking, too overwhelmingly cruel to be faced squarely. Hence, the Unmentionable. The reality of our ugly national character, the reality of the vile bestiality we are capable of, our unholy fanaticism for the goddess they call 'Enlightened Moderation.' The goddess with fair tresses and cleavage who comes flashing on TV all the time. Like the picture of Dorian Gray mirroring the ugliness, obscured from view to keep the visage attractive and pleasing: Enlightened and Moderate. A visage beneath which hulks a terror_ that if the picture mirroring the reality is brought out, the thin covering will wear off and give way. The Picture of Dorian Gray, locked up carefully, grows uglier by the day, its rotting teeth gaping horribly, the eye sockets darkly caving in, the sickly skin wearing off. Yet still it wears that wicked smile that speaks of is triumph. Eventually. Mirroring our ugliness all the time, growing more horrible_ doling out to us days to make merry living up to the 'progressive image.'

The greatest support this regime claims it enjoys is of that magical, mythical, fantastical entity: the Silent Majority. Then what to make of my neighbour next door, my colleague at work, the bystander there, the patient in the doctor's waiting room and the client at the barber's_both cleanshaven and bearded_ who, that fateful day, confided in me the pain, the disapproval, the outrage over the incident. What to make of the numerous nameless callers on private TV channels whose voices choked with tears as they spoke? What about the numerous messages I, and so many of my friends received soaked in blood and tears? I think: The 'silent majority' is the repressed and gagged silenced majority in the grip of the empowered, favoured and heavily petted elitist U.S-educated minority.

How about that majority all the way back in 1947 that chanted on the streets that battle cry 'Pakistan ka matlab kiya, La ilaha ill allah'. How about the majority that was gathered that day in February 1948, intently listening to the sound of their Great Leader who declared, " It is my belief that our salvation lies in following the golden rules of conduct set for us by our great law-giver, the Prophet (S) of Islam. Let us lay the foundations of our democracy on the basis of truly Islamic ideals and principles."

And again, at Karachi the same year, he said to the tens of thousands before him: "I do not understand a section of the people who deliberately want to make propaganda that the constitution of Pakistan would not be made on the basis of the Shariah (Islamic Law). Islamic principles are as applicable today as they were 1300 years ago... Islam has taught equality, justice and fairplay to everybody... Let us make it (the Shariah) the future constitution of Pakistan. We shall make it and we shall show it to the world."

That same leader, while addressing a gathering at Waziristan outlining the Frontier policy had said on April 17, 1948: "Pakistan has no desire to unduly interfere with your freedom. On the contrary, Pakistan wants to help you and make you, as far as it lies in our power, self-reliant and self-sufficient and help in your educational, social and economic uplift... We Musalmans believe in One God, one Book and one Prophet (S). So we must stand united as one nation. In unity lies strength; united we stand, divided we fall."

It becomes poignant here. Fast forward to 2007. The idealism, the aspirations,, the dreams, the promises, the Cause lived and died for all dashed to the ground in one fell sweep. The Original Sin of the cannon-fodder at the Lal Masjid was